جلد 7 شمارہ 2، 3

مئی تا دسمبر 2014

چیلنج

ایڈیٹرز: عذرا طلعت سعید/صبیحہ حسن

عالمی دنیا پائیدار ترقی کے لیے اہداف کی نشاندہی کے لیے کوشاں ہے۔ سرمایہ دار ممالک بھی ترقی کو ایک دفعہ پھر اپنے مفاد اور منافع کے لیے استعمال کرتے ہوئے نجی شعبے کو اہم ترین ستون کے طور پر دنیا پر مسلط کرنے کی مکمل تیاری کر چکے ہیں۔ یہی کچھ نوآبادیات کے سیاہ دور میں بھی ہوا۔ انگریز سامراج نے ملٹی نیشنل کمپنیاں قائم کر کے تیسری دنیا کے مزدور کو غلام بنا کر ایک سیاہ تاریخ رقم کی اور نوآبادیات سے اربوں کھربوں روپے کی دولت لوٹ کر ترقی یافتہ صنعتی ممالک کی حیثیت اختیار کر لی۔

آج عالمگیریت کے اس دور میں یہی کمپنیاں ایک بار پھر تیسری دنیا کی معیشت اور مزدور کے استحصال کے لیے نئے طریقے نافذ کر رہی ہیں۔ آقا اور غلام کے سیکھے ہوئے پرانے رشتوں کو دل سے لگائے آج بھی پاکستانی حکومت آقاؤں کے احکامات پر عمل درآمد پر کمربستہ ہے جس کی مثال قومی اسمبلی میں پیش کردہ مجوزہ سیڈ ایکٹ 2014 ہے جو ملٹی نیشنل زرعی کمپنیوں اور عالمی زرعی سرمایہ کاروں کے لیے راہ ہموار کرنے کی ایک بھیانک سازش ہے۔ اس قانون سازی کے بعد کسان جو بیج اور زراعت کا اصلی وارث ہے ملٹی نیشنل کمپنیوں اور منڈی کا مکمل محتاج ہو کر مزید پس جائیگا۔

پاکستانی معیشت عالمی مالیاتی اداروں اور ڈبلیو ٹی او کے سنگین معاہدوں کی وجہ سے پہلے ہی تباہی کا شکار ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کی پیداوار صنعت کو کچلا گیا اور خدمات کے شعبے کو فروغ دیا گیا جو مکمل طور پر بیرونی سرمایہ کاری کا محتاج ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس امر کی تھی کہ ہنگامی بنیادوں پر زراعت جس پر خصوصی توجہ دی جاتی اور بجٹ میں اس شعبے کے لیے خاطر خواہ رقم مختص کی جاتی کے بجائے آمدنی کے لیے قومی اداروں کی فروخت کا منصوبہ بنا لیا گیا، ساتھ ساتھ غیر ترقیاتی اخراجات اور قرضوں کی واپسی کی مد میں خطیر رقم مختص کر دی گئی۔

زرعی زمینوں پر صنعتوں کے قیام سے بھی زرعی پیداوار میں پہلے ہی کمی واقع ہوئی ہے اور چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے روزگار اور خوراک پر کاری ضرب لگی ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان میں سے کئی صنعتوں میں ایسی مصنوعات تیار کی جا رہی ہیں جن سے نا صرف انسانی صحت کو شدید خطرات لاحق ہیں بلکہ سنگین ماحولیاتی تباہی کے ساتھ ساتھ زمین کی زرخیزی پر بھی انتہائی منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور دوسری جانب اس زہریلے کاروبار سے سرمایہ دار طبقے کے منافع میں کئی گنا اضافہ ہو رہا ہے۔

ان حالات میں بین الاقوامی ادارے بھی عوام الناس کے مفاد کے خلاف سرگرم عمل ہیں جن میں سب سے آگے امریکی ادارہ یو ایس ایڈ ہے۔ کیری لوگر بل جو کہ بڑھ چڑھ کر پاکستانی عوام اور ریاست سے ایک پائیدار تعلق کو استوار کرنے کے لیے منظور کیا گیا تھا، کی چونکا دینے والی حقیقت یہ ہے کہ اس امداد کی ایک کثیر رقم افغان مہاجرین اور پاکستان افغانستان کے سرحدی علاقوں پر خرچ کی گئی مزید یہ کہ 2013 کے بعد سے امداد کا بقیہ حصہ اب تک جاری نہیں کیا گیا۔

بظاہر یہ ادارہ تیسری دنیا کی ترقی کے لیے امداد فراہم کرنے کا دعویدار ہے لیکن اگر امداد کی تفصیلات کا باریک بینی سے تنقیدی جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضع ہوتی ہے کہ امداد کا مقصد تیسری دنیا کی ترقی کے بجائے امریکہ کے سیاسی و معاشی مفادات کا فروغ اور اس کی حفاظت ہے۔ پاکستان میں دیکھنے میں آیا ہے کہ ان امدادی منصوبوں کے ذریعے نا صرف پاکستانی منڈی بلکہ افغانستان اور دیگر ممالک کی منڈیوں تک بھی آسان رسائی حاصل کی گئی۔

عالم انسان اور خصوصاً پاکستانی عوام استحصالی قوتوں کے شکنجے میں پھنس کر ذلت، بھوک اور غیر محفوظ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ زندگی ایک گہری کھائی کے در پر آ چکی ہے۔ اس تباہی سے صرف عوام اپنی مزاحمت کے زور سے انسانیت کو بقاء کے راستے پر لا سکتی ہے۔

فہرست مضامین

پاکستان میں بیج کی سیاست: 2
وفاقی بجٹ 15-2014: ایک جائزہ 6
بین الاقوامی امدادی ادارے یو ایس ایڈ 14
ملٹی نیشنل کمپنیاں: 26
ملٹی نیشنل کمپنیاں: 26
ہری پور کے پہاڑوں میں کان کنی 33
بات تو سچ ہے مگر 38

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے
میزیریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون: 3320 3481 21 0092 فیکس: 3321 3481 21 0092
ای میل: roots@super.net.pk

پاکستان میں بیج کی سیاست: ایک کسان دشمن پیش رفت

ولی حیدر

''بیج سرمایہ دارانہ زراعت کے فروغ کے لیے ایک کلیدی نکتہ ہوسکتا ہے اور اسی طرح ہوا بھی ہے لیکن آج تک بیج نے بڑی بددلی کے ساتھ ایک پیداواری شئے کی شکل اختیار کی ہے اور یہ حیثیت بھی پوری طرح مکمل نہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ صرف قانون اور سائنس کے براہ راست استعمال کے ذریعہ ہی بیج پر قبضہ کیا گیا ہے۔ بیج کی حیاتیاتی ساخت سرمایہ اکھٹا کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے کیونکہ مناسب حالات میں بیج خود بخود کئی دفعہ اپنے آپ کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ بیج کی یہ قدرتی خاصیت منافع کے لیے بیج کی نئی اقسام پیدا کرنے والوں کے مفادات میں بھاری رکاوٹ ہے''۔ (فرسٹ دی سیڈ، جیک رالف کلوپنبرگ)

پاکستان میں تاریخی طور پر بیج کی پیداوار اس کی ترسیل مختلف ادوار سے گزری ہے۔ 1947 سے 1960 تک زراعت کے محکمہ اور 1960 سے 1972 تک یہ ذمہ داری مغربی پاکستان کی زرعی ترقیاتی کارپوریشن یا ویسٹ پاکستان ڈیولپمنٹ کارپوریشن (WPDC) کے پاس رہی۔ 1972 کے بعد بیج کی خریداری اور تقسیم صوبائی محکمہ کے حوالے کردی گئی۔

1973 میں اقوام متحدہ کے ادارے برائے خوراک اور زراعت (FAO) نے نجی شعبہ کی شراکت سے بیج کی صنعت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا مگر صوبائی حکومتوں نے اس منصوبے میں نجی شعبے کی شمولیت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ 1976 میں ورلڈ بینک نے صوبائی حکومتوں کی خواہش پر نیم رضامندی کے ساتھ بیج کی سرکاری صنعت کے قیام کے منصوبہ پر آمادگی ظاہر کی۔ اسی سال بیج کی پیداوار اور تقسیم کے انتظام کے لیے بیج کا قانون 1976 (Seed Act 1976) نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت منتخب شدہ بیجوں کی اقسام کا بغیر تصدیق اور رجسٹریشن کے خرید و فروخت، لین دین، تبادلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ ورلڈ بینک نے اس مقصد کے لیے 13 بلین ڈالرز کی مالی مدد بھی فراہم کی۔

سیڈ ایکٹ 1976 کے تحت دو سرکاری سیڈ کارپوریشنز کا قیام عمل میں لایا گیا، ایک پنجاب اور دوسری سندھ میں۔ چاروں صوبوں میں صوبائی سیڈ کونسل اور مرکز میں نیشنل سیڈ کونسل کی تشکیل بھی ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ وفاقی سیڈ سرٹیفکیشن اور قومی رجسٹریشن ایجنسی کا بھی قیام عمل میں لایا گیا۔ جو اب وفاقی سیڈ سرٹیفکیشن اینڈ رجسٹریشن کے محکمہ میں ضم ہوگئے ہیں۔ خیبر پختون خواہ میں بیج کی پیداوار اور تقسیم ایک خود مختار ادارے کے تحت ہورہی تھی جو 1997 میں تحلیل ہو کر زرعی ترقیاتی فنڈ (Agriculture Development Fund) میں تبدیل ہو گیا۔ بلوچستان میں بیج کی سرگرمیاں محکمہ زراعت کے تحت ہی جاری رکھنے کی منظوری دی گئی۔ 1981 میں نجی شعبہ کو بیج کی پیداوار میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی۔

1994 میں بیج کے کاروبار کو باقاعدہ صنعت کا درجہ دے دیا گیا جس کے تحت اب تک پانچ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ملک میں بیج کے کاروبار کی اجازت دی گئی۔ جبکہ مجموعی طور پر 760 نجی بیج کمپنیوں کو بیج کے کاروبار کی اجازت دی گئی۔ (یہ خیال رہے کہ یہ وہی زمانہ ہے کہ جب عالمی تجارتی ادارے {WTO} بننے کے اقدامات عالمی سطح پر بڑے زور شور سے کیے جارہے تھے اور ڈبلیو ٹی او کے تحت ہی بیج پر ذہنی ملکیت کے معاہدوں کی منظوری پر سرتوڑ کوشش کی جارہی تھی جو کے 1995 میں ڈبلیو ٹی او کے قیام سے کامیاب ہوگئی)۔

زرعی ماہرین اور عالمی اداروں کا کہنا ہے کہ پاکستان کی بیج کی ضرورت ان اقدامات سے پوری نہیں ہوسکی اور توقعات سے کہیں کم کامیابی حاصل ہوئی۔ موجودہ بیج کی صنعت ضرورت کا صرف 23 فیصد پورا کرپارہی ہے۔ اس لیے بیج کی صنعت میں نجی شعبے کی مزید شمولیت بہت ضروری ہے اور انہیں مائل کرنے کے لیے قانون سازی بھی ضروری ہے۔ دوسری طرف امریکی محکمہ زراعت کے بین الاقوامی زرعی خدمات کی جاری کردہ گلوبل ایگریکلچر انفارمیشن نیٹ ورک رپورٹ 2012 (The GAIN Report 2012) میں پاکستان میں بیج اور پلانٹ بریڈرز کے حقوق کی حفاظت کے قوانین کی عدم موجودگی کی نشاندہی کی گئی اور اس کمی کو بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے بیج کے شعبے میں سرمایہ کاری میں رکاوٹ قرار دیا گیا تھا۔ GAIN (گین) رپورٹ کے مطابق پلانٹ بریڈرز کے حقوق کی حفاظت اور سیڈ بل کا نہ ہونا ڈبلیو ٹی او کے معاہدے ٹریڈ ریلیٹڈ ایسپکٹس آف انٹلیکچوئل پراپرٹی رائٹس (TRIPs) کی خلاف ورزی ہے۔[1] اس طرح 2013 میں امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ پاکستان نے زراعت کے شعبے میں ذہنی ملکیت کے قوانین کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کیے جو ڈبلیو ٹی او کے TRIPs (ٹرپس) معاہدے کے تحت ضروری ہیں۔ پاکستان نے جینیاتی ٹیکنالوجی کے تحفظ کے لیے بھی انٹلیکچوئل پراپرٹی رائٹس (IPR's) نہیں منظور کئے جو امریکی بیج کمپنیوں کے لیے پاکستانی منڈی میں داخل ہونے میں رکاوٹ ہے۔[2]

اسی پس منظر میں 2009 میں بیج کا ترمیمی بل پیش کیا گیا جس میں نجی شعبے کو ترغیب دینے کے لیے 1976 کے سیڈ ایکٹ میں ترامیم تجویز کی گئی تھیں مگر مختلف گروہوں مثلاً زمینداروں کی جانب سے اس عمل کی سخت مخالفت کی وجہ سے اسے منظوری نہ مل سکی۔ رواں سال کے اوائل (مارچ 2014) میں بیج کے ترمیمی ایکٹ پر زور و شور سے پیش رفت شروع ہوگئی۔ اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد زراعت اب ایک صوبائی شعبہ ہے اور اسی بنیاد پر پہلے کے پی کے اور پھر پنجاب حکومت نے ''سیڈ بل'' اپنی اپنی اسمبلیوں میں پیش کیا۔ بیج کے حوالے سے قانون سازی پر دونوں

مواقعوں پر پاکستان بھر کے کسانوں نے متعلقہ صوبائی دارالخلافہ میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ صوبائی حکومتوں کی اس پیش رفت کے خلاف پر بھرپور آواز بلند کی۔ کے پی کے اسمبلی کے ارکان نے اس سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنے کی یقین دہانی بھی کروائی، مگر جولائی میں ایک خصوصی قرار داد کے ذریعے صوبوں نے بیج پر قانون سازی کا اختیار وفاقی حکومت کو دے دیا۔ جس کے تحت مجوزہ ترمیمی سیڈ ایکٹ 8 اگست، 2014 کو وفاقی وزیر قومی غذائی تحفظ وتحقیق سکندر حیات خان بوسن نے قومی اسمبلی میں پیش کیا۔ وفاقی وزیر کے مطابق 1976 کے بیج کے قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے کیونکہ موجودہ قوانین جدید بیج کی صنعت کی ضروریات کے لیے ناکافی ہیں۔[3]

مجوزہ ترمیمی ایکٹ کی رو سے کسی فرد یا ادارے کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ وہ بغیر رجسٹریشن بیج کی خرید وفروخت کرے۔ بیج کی دوبارہ کاشت یا ہائبرڈ اور نیم ہائبرڈ بیج کی فروخت پر بھی پابندی ہوگی۔ اسی ایکٹ کے تحت پاکستان میں جینیاتی فصلوں کی کاشت کی بھی اجازت ہوگی۔ مجوزہ ترمیمی ایکٹ کے چیدہ چیدہ نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- نجی شعبے کے لیے بنیادی بیج (Pre-basic Seed) کی موجودگی۔
- نجی شعبے میں بیج کی جانچ پڑتال کے لیے مستند لیبارٹریوں کا قیام۔
- بلا تصدیق اور غلط برینڈ (نام) بیج (misbranded) کی اقسام پر پابندی۔
- جینیاتی فصلوں کی پیداوار اور کاروبار کی اجازت۔
- ایکٹ پر عمل درآمد کے لیے جرمانہ اور سزاؤں کا نفاذ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی سیڈ ایکٹ 2014 کا مسودہ بین الاقوامی زرعی کمپنیوں اور امریکی محکمہ زراعت کے مطالبات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ جن میں مونسانٹو، ڈاؤ، پائی نیئر، سنجنٹا اور دیگر کمپنیاں شامل ہیں۔ مونسانٹو اکیلے ہی جینیاتی بیجوں کی منڈی میں 87 فیصد کاروبار کی مالک ہے۔[4] ای ٹی سی گروپ کے مطابق دنیا کی تین بڑی کمپنیاں کل بیجوں کی تقریبا 50 فیصد منڈی پر قابض ہیں۔[5] ایک طرف پاکستان میں جینیاتی فصلوں کی کاشت پر کھلی چھوٹ دینے کی طرف پیش رفت زوروں پر ہے جبکہ دوسری طرف یورپی ممالک جینیاتی بیجوں کی شدید مخالفت کررہے ہیں۔ ان ممالک کی عوام جینیاتی غذا کو ہیبت ناک قرار دیتے ہیں۔ برطانیہ کے پرنس چارلز کا کہنا ہے کہ جینیاتی بیج، فصلیں اور غذا ماحولیاتی تباہی کی موجب ہیں۔[6] پورے یورپ کے صرف تین ممالک میں جینیاتی فصلیں اگائی جارہی ہیں۔ فرانس اور جرمنی جیسے انتہائی ترقی یافتہ ممالک جینیاتی فصلوں کو اگانے سے انحراف کررہے ہیں۔[7]

مزید یہ کہ چین نے بھی جینیاتی چاول اور مکئی کی کاشت پر پابندی عائد کردی ہے۔[8] روس کے وزیراعظم کا کہنا ہے کہ امریکی جینیاتی فصلیں کھانا چاہتے ہیں تو کھائیں۔ روس کے پاس اتنی زمین اور مواقع ہیں کہ وہ اپنے لیے مقامی طور پر غذا اگا سکتا ہے۔[9] لے دے کر جینیاتی غذاؤں کی سب سے بڑی وجہ خود امریکہ ہے چونکہ دنیا کی سب سے بڑی جینیاتی کمپنیاں خاص کر مونسانٹو جیسی بڑی کمپنیاں امریکی ہیں جنہوں نے اپنے منافع کی خاطر امریکی حکومت کے مکمل تعاون سے امریکی عوام کو جینیاتی غذا کھانے پر مجبور کیا ہے۔ دنیا کے 64 ممالک میں جینیاتی کھانوں پر تحریری مواد کی اشاعت ضروری ہے تاکہ صارف اپنی مرضی سے سوچ سمجھ کر جینیاتی خوراک اور دیگر مصنوعات خریدے لیکن ان کمپنیوں نے امریکہ میں اس قانون کو منظور نہیں ہونے دیا۔[10]

جینیاتی بیج کمپنیوں کی منڈی ترقی یافتہ ممالک میں کم ہوتی جا رہی ہے چنانچہ ان کی توجہ تیسری دنیا کے ممالک پر ہے جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ انہی حالات کی بنا پر پاکستان اور دیگر ایشیائی اور افریقی ممالک میں بیج کے حوالے سے نئے قوانین بنانے پر بہت زور دیا جا رہا ہے جس کے لیے امریکی حکومت کے کئی محکمے جن میں محکمہ زراعت (یو ایس ڈی اے) اور محکمہ برائے بین الاقوامی امداد (یو ایس ایڈ) پیش پیش ہیں۔ جو تیسری دنیا کی حکومتوں بشمول پاکستان کو جینیاتی بیج اور جینیاتی جانوروں کی پیداوار اور استعمال پر زبردستی ترغیب اور تلقین کر رہی ہیں۔ ان محکموں کا کہنا ہے کہ جینیاتی ٹیکنالوجی کو اپنانے سے پاکستان جیسے ممالک ایک طرف اپنی معیشت کو فروغ دے پائیں گے اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک فراہم کر پائیں گے۔ حکومت پاکستان ان تجاویز کو اپنانے پر کمر بستہ نظر آتی ہے۔

امریکہ نے اپنی تسلط کے دوران عراق میں کولیشن ڈویژنل اتھارٹی (CPA) کے تحت CPA آرڈر 81 جاری کیا۔ جس کے تحت عراقی بیج کے قانون میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ عراقی کسان اپنا بیج محفوظ کرنے اور اس کے خرید وفروخت کے اختیار سے محروم ہوگئے۔ امریکی امدادی ادارہ یو ایس ایڈ نے عراق میں زراعت کی بحالی اور ترقی کے ایگریکلچرل ری کنسٹرکشن اینڈ ڈیولپمنٹ فار عراق (ARDI) کے نام سے ایک منصوبہ متعارف کروایا۔ جس کے تحت زرعی مشینوں، کیمیائی کھاد اور بیج کو فروغ دیا گیا۔ اسی منصوبے کے تحت امریکی فوج نے ہزاروں ٹن کیمیائی کھاد اور بیج عراقی کسانوں میں تقسیم کیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکی قبضے کے قبل 97 فیصد عراقی کسان اپنا ہی محفوظ کیا ہوا بیج استعمال کیا کرتے تھے۔[11] اسی طرح افغانستان میں بھی FAO (ایف اے او) کی سرپرستی میں بیج کے قانون میں تبدیلی کی خبریں ہیں جس کے تحت افغانستان کی زراعت پر بین الاقوامی کمپنیوں کا کردار بڑھ جائے گا۔[12]

مجوزہ سیڈ ایکٹ کی ایک شق کے رو سے اگر کوئی فرد یا کسان غیر منظور شدہ اور غلط نام والے بیج کی کاشت یا خرید وفروخت کرے گا تو مجرم تصور کیا جائے گا۔ پہلی دفعہ یہ جرم کرنے پر 25 ہزار روپے جرمانہ اور چھ ماہ تک قید کی سزا ہوسکتی ہے۔ جبکہ دوسری دفعہ اس جرم کے ارتکاب پر دو سال قید اور دو لاکھ روپے جرمانہ عائد ہوگا۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جس ملک کی کسان آبادیاں اپنا شناختی کارڈ اور بینک

اکاؤنٹ کھلوانے کے نظام میں آسان شرائط کو پیچیدہ سمجھتے ہوئے ان کی ایک بڑی اکثریت ان اداروں تک رسائی سے قاصر ہیں، اس معاشرے میں بیج کی کسی مخصوص ادارے سے تصدیق اور رجسٹریشن جیسے انتہائی گھمبیر اور پیچیدہ ضابطوں کو کیسے پورا کرپائیں گے۔ مستقبل میں کسانوں کو پیش آنے والی مشکلات اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے بیج کے حوالے سے طے کیے گئے ضابطوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ایف اے او کی ایک دستاویز کے مطابق عام طور پر بیج کو مختلف درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ بریڈر سیڈ	(کسانوں کا بیج)	پہلا مرحلہ
2۔ پری بیسک سیڈ	(بنیادی بیج سے پہلے)	دوسرا مرحلہ
3۔ بیسک سیڈ	(بنیادی بیج)	تیسرا مرحلہ
4۔ سرٹیفائیڈ سیڈ	(منظور شدہ بیج)	چوتھا مرحلہ

پہلے مرحلے (کسانوں کے بیج) میں بیج منظور یا تصدیق کرنے والے ادارے کی نگرانی نہیں ہوتی جبکہ تیسرے اور چوتھے مرحلے (بنیادی بیج اور منظور شدہ بیج) کی نگرانی کی جاتی ہے۔ بیج کی جانچ پڑتال کرنے والا ادارہ بیج کے معیار کی کھیتوں اور لیبارٹری دونوں ہی جگہوں پر تصدیق کرتا ہے۔[13]

یہ بات یقینی ہے کہ بیج کے حوالے سے ہونے والی قانون سازی کے بعد پاکستان کو بھی اوپر دیے گئے تمام مراحل پر اسی انداز میں عمل درآمد کرنا ہوگا۔ کسان صدیوں سے غیر رسمی طور پر اپنے بیج کے معیار کو بڑھانے اور اسے بطور بیج استعمال کے لیے مختلف درجوں میں بانٹتے رہے ہیں اور اسی طریقہ کار کے تحت اعلیٰ سے اعلیٰ بیج تیار کرتے رہے ہیں۔ مگر اب یہ تمام کام جو غیر رسمی طور پر سال ہا سال کئی صدیوں سے ہورہا تھا اس ایکٹ کی منظوری کے بعد بیج بنانے کے عمل میں کسانوں کا کردار یکسر ختم ہوجائے گا اور ان کی جگہ نام نہاد سائنسی ادارے اور ملٹی نیشنل کمپنیاں لے لیں گی۔ یہ ایک خوفناک پیش رفت ہے! زراعت کے سب سے اہم ترین پیداواری ذریعے یعنی بیج کا اختیار کسانوں سے چوری کرنے کا عمل نہ صرف دنیا کی بہت بڑی آبادی کے بنیادی حقوق کی نفی ہے بلکہ ان کے روزگار کے ساتھ کھلواڑ ہے؟

ایک طرف دنیا پہلے ہی بھوک و افلاس کی آماجگاہ بن کر رہ گئی ہے جہاں تقریباً ایک ارب کی آبادی شدید بھوک کا شکار ہے اور دوسری طرف مزید بھوک پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لاکھوں کسانوں کے پاس بیج نہیں ہوگا اور وہ بیج کے لیے منڈی کے محتاج ہوجائیں گے تو نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے خوراک کیونکر اگا پائیں گے؟

مجوزہ ترمیمی سیڈ ایکٹ 2014 قومی زرعی پالیسی 2014 کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پیش کیا گیا کہ جس میں کہا گیا ہے کہ ''1976 کے بیج کے قانون میں اس حد تک ترمیم کی جائے کہ بیج کی صنعت اور کاروبار میں نجی شعبہ کو درپیش تمام رکاوٹوں کا خاتمہ ہوجائے''۔ سیڈ پالیسی 2014 کے چیدہ چیدہ نکات درجہ ذیل ہیں:[14]

- نجی بیج اگانے والوں (Private Breeders) کا حکومتی/سرکاری جینیاتی وسائل کے ذخائر تک رسائی۔
- نجی شعبے کو اپنے بیج کی اقسام جاری کرنے کی اجازت۔
- جینیاتی (جی ایم اوز) فصلوں اور بیج کی اجازت۔
- نجی شعبے کو تحقیق کے لیے حوصلہ افزائی مراعات کی فراہمی۔
- سرکاری تحقیق تک نجی شعبے کی آزادانہ رسائی۔
- حکومت کا جینیاتی کپاس، مکئی اور چاول کے فروغ کے لیے مکمل تعاون۔
- ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے بیج درآمد کرنے پر مراعات۔

زرعی پالیسی میں بتائے گئے چیدہ چیدہ نکات سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت نے فیصلہ کرلیا ہے کہ پاکستانی زراعت کو نجی شعبوں کے حوالے کردیا جائے جس کے نتیجے میں پاکستانی اداروں اور کسانوں کی خودمختاری کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہ کسی المیہ سے کم نہیں کہ پاکستانی کسانوں سے مراعات واپس لی جارہی ہیں اور قومی زرعی پالیسی میں نجی شعبہ کو مراعات دینے کی ترغیب اور لالچ دی جارہی ہے۔ اربوں ڈالرز سرمائے کی مالک ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ان کے منافع میں مزید اضافہ کے لیے حکومت راہیں ہموار کررہی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتی تحقیقی ادارے اور افراد اس حد تک ناکارہ ہیں کہ اگر انہیں یہی مراعات اور سہولیات دی جائیں تو وہ اس ملک کی زراعت اور کسانوں کی ترقی و خوشحالی کے لیے کام نہیں کریں گے؟ کیا ان کی صلاحیت ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کام کرنے والوں سے کسی طور کم ہے؟

قومی زرعی پالیسی 2014 کے حوالے سے ایک ورک شاپ سے خطاب کرتے ہوئے وفاقی قومی غذائی تحفظ و تحقیق کے وزیر سکندر حیات بوسن نے کہا کہ ترمیمی بل قومی اسمبلی کی اسٹنڈنگ کمیٹی سے منظوری کے بعد جلد ہی قومی اسمبلی سے منظور ہوجائے گی اور ساتھ ہی پلانٹ بریڈرز کے حقوق کا قانون بھی قومی اسمبلی میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ میری وزارت اور کیبنٹ ڈویژن ان بلوں کو بطور قانون منظور کروانے کی بھرپور کوششوں میں مصروف ہے۔ اگر ایسا ہوجاتا ہے تو سرکاری اور نجی شعبہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کرسکے گا۔[15]

سندھ آباد گار بورڈ نے پلانٹ بریڈرز کے قانون کو فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا ہے اور خدشہ ظاہر کیا ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد کے نتیجہ میں پاکستانی زرعی شعبہ میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری قائم ہوجائے گی۔ مقامی کسانوں کو انتہائی مہنگے بیج اور رائلٹی کے مد میں بے تہاشہ رقم ادا کرنی پڑے گی۔ اس قانون سے غیر ملکی بیج کی براہ راست پاکستانی منڈی میں فروخت ممکن ہوجائے گی جو کہ سراسر مقامی کسانوں کے حق پر ڈاکہ ہے۔[16]

پاکستان کسان مزدور تحریک (پی کے ایم ٹی) ضلع چارسدہ کے کسان رہنما ناصر خان کا کہنا ہے کہ ''میں ایسے کسان کو کسان ہی تسلیم نہیں کرتا جس کے پاس اپنا بیج نہ ہو''۔ بیج اور کسان آپس میں لازم و ملزوم ہیں اس قانون کے ذریعہ کسانوں سے

بیج کی ملکیت لے کر بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حوالے کرنا ایک انتہائی گھناؤنا کسان دشمن اور ملک دشمن امر ہے۔ کیونکہ ایک خود مختار کسان ہی خوشحال پاکستان کی ضمانت ہے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کی تمام خوراک کی پیداوار کا 80 فیصد چھوٹا کسان اگاتا ہے۔ اگر یہ چھوٹا کسان جو پوری دنیا کو خوراک فراہم کررہا ہے تباہ ہوجائے تو کون دنیا کو خوراک دے گا؟ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں جو منافع کی حوس میں لوگوں کے روزگار سے کھیل رہی ہیں؟

حکومتیں تو اپنی عوام کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ حکومتوں کا کام تو عوام کو منڈی کے جبر سے محفوظ رکھنا ہے مگر یہاں تو الٹی گنگا بہتی ہے، حکومت ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مفاد کے لیے اپنی عوام کے گلے پر چھری پھیرنے پر عمل پیرا ہے۔ مجوزہ سیڈ ایکٹ اس کا ایک عملی نمونہ ہے۔ حالانکہ جنوری 2012 میں پنجاب حکومت نے جینیاتی کپاس (BT Cotton) پر پابندی عائد کرتے ہوئے کہا تھا کہ جینیاتی فصلیں دوسرے پودوں اور ماحولیات پر مضر اثرات ڈال سکتی ہیں۔ لاکھوں چھوٹے بے زمین کسانوں کی روزی روٹی اور قومی غذائی تحفظ پر یکدم موقف تبدیل کرنا اگر مجرمانہ عمل نہیں تو انتہائی غیر ذمہ دارانہ عمل ضرور ہے۔

کسان صدیوں سے اپنے بیج بو کر پیداوار حاصل کررہے ہیں۔ حکومت ان کی حوصلہ افزائی کے بجائے ان سے بیج محفوظ کرنے، اس کا تبادلہ، کاروبار کرنے اور پیداوار حاصل کرنے کا حق چھینتے ہوئے ہمارے لیے بہتر روزگار کے حصول کو مزید مشکل بنارہی ہے۔ پاکستانی کسانوں کو جبراً کارپوریٹ بیج خریدنے پر مجبور کرکے انہیں کمپنیوں کا غلام بنایا جارہا ہے۔ یہ یقیناً کھلی سامراجیت ہے! کسان ان کارپوریشنز کو اپنے ذریعہ معاش پر قابض ہونے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ حکومت ایسے قوانین نافذ کرے جو کسان کو بیج پر خود مختاری دیتے ہوں۔ یعنی بیجوں کو محفوظ کرنے، ان کا تبادلہ اور کاروبار کرنے اور ان سے پیداوار حاصل کرنے جیسے بنیادی حقوق کسان کے ہاتھ میں ہوں نا کہ یہ حقوق دیوہیکل بین الاقوامی زرعی کمپنیوں کو دے دیے جائیں۔

بیج کی لڑائی کو تکنیکی اور سائنسی بنیاد پر لڑنے کے بجائے سیاسی بنیادوں پر لڑنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف بیج پر قبضہ کی سازش نہیں بلکہ پورے زرعی پیداواری نظام کو یرغمال بنانے کے مترادف ہے۔ وسائل پر قبضہ کی حرص نے سرمایہ دارانہ نظام کے حواریوں کو اخلاقی پستی کی انتہائی نچلی سطح پر لاکھڑا کیا ہے۔ جہاں خوراک پر قبضہ کی ذریعہ انسانوں پر راج کرنے کی حکمت پر عمل درآمد اب تیز تر ہوگیا ہے۔

دنیا بھر کے کسانوں، انسان دوست تنظیموں اور افراد کو بیج اور زراعت پر سرمایہ داروں کے قبضہ کی کوششوں کو متحد ہوکر ناکام بنانے کی اور روایتی بیج کو محفوظ کرنے، اسے پھیلانے اور بڑھانے کے عمل کو عوامی سطح پر تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنی تیز رفتاری کسان دشمن سرمایہ کار دکھارہے ہیں کم از کم اتنی ہی تیزی کسانوں کو بھی دکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ کسانوں کی بقاء کی جنگ ہے اور اس جنگ کو ہر صورت کسانوں نے ہی جیتنا ہے۔ جو صرف اور صرف کسانوں کی یکجہتی اور مشترکہ جدوجہد میں پنہا ہے۔ یہی سرمایہ دارانہ زراعت کی نفی ہے اور سرمایہ دارانہ زراعت کی موت ہے!

حوالہ جات

1. GAIN Report 2014, Global Agricultural Information Network, October 19, 2014, accessed from www.thefarmsite.com/reports/contents/ chidoct12.pdf
2. Bokhari, Ashfak. "Centre retrieves seed business from provinces." DAWN, August 18, 2014, p. 4.
3. "Draft seed bill seeks to end public sector monopoly." DAWN, August 9, 2014, accessed from http://www.dawn.com/news/1124178
4. Etc Group. "Who owns nature? Corporate power and the final frontier in the commodification of life." Communique Issue #100, November 2008. Accessed from http://www.etcgroup.org/content/who-owns-nature
5. Ibid.
6. Randall, Jeff. "Prince Charles warns GM crops risk causing the biggest-ever environmental disaster." The Telegraph, August 12, 2008, accessed from http://www.telegraph.co.uk/news/earth/earthnews/3349308/Prince-Charles-warns-GM-crops-risk-causing-the-biggest-ever-environmental-disaster.html
7. RFI. "France, Germany want right to ban GMOs after EU maize vote." February 14, 2014, accessed from http://www.english.rfi.fr/americas/20140214-france-germany-want-right-ban-gmos- after-eu-maize-vote
8. Heyes, J.D. "China refuses to permit GM rice and corn to be grown by research groups." Natural News, September 3, 2014. Accessed from http://www.naturalnews.com/ 046718_GMO_rice_GM_corn_China.html
9. "Russia will not import GMO Product-PM Medveder." RT News, April 7th 2014. Accessed from http://rt.com/news/russia-import-gmo-products-621/
10. McKay, Tom. "64 countries have taken the bold stand against Monsanto the U.S won't." News. Mic, May 13, 2014, accessed from http://mic.com/articles/89341/64-countries-have-taken- the-bold-stand-against-monsanto-the-u-s-won-t
11. Kelly T. Crosby, "The United States: Plant Patent Protection and Saving Seed," 9, 2010, p.513.
12. PANAP & GRAIN, 2010, Asia's Seed Laws - Control Over Farmers' Seeds, PANAP Rice Sheet. Pesticide Action Network Asia and the Pacific (PANAP), Penang, Malaysia.
13. A.J.G. van Gastel, at al. "Wheat seed production." FAO corporate document repository, accessed from http://www.fao.org/docrep/006/y4011e/y4011e0v.htm
14. Government of Pakistan, Ministry of National Food Security and Research, Islamabad. "Pakistan National Seed Policy (Draft). Distributed at the National Workshop on Seed Policy Consultation, November 2014, Islamabad.
15. "NA likely to pass ' Seed (Amendment) Bill, 2014', November 14, 2014 accessed from http://www.dailytimes. com.pk/business/14-Nov-2014/na-likely-to-pass-seed- amendment -bill-2014
16. "Plant breeders rights law will help foreign firms monopolise farm sector." DAWN, July 1, 2014.

وفاقی بجٹ 15-2014: ایک جائزہ

تحریر: صبیحہ حسن

بجٹ کا سیاسی اور اقتصادی وژن

وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، اقتصادی امور، سینٹر محمد اسحاق ڈار نے قومی اسمبلی میں اپنی بجٹ تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

> ''آج کا پاکستان، ایک سال پہلے کے پاکستان سے کہیں زیادہ توانا، کہیں زیادہ صحت مند اور کہیں زیادہ روشن ہے ... لیکن ... ہمیں معلوم ہے کہ ہماری حقیقی منزل ابھی دور ہے''۔[1]

اپنی حکومت کی ایک سالہ ''اعلیٰ'' کارکردگی کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے اس وژن (دور اندیش نظریے) کا ذکر کیا جو کہ پچھلے بجٹ سے ان کی پالیسیوں کی رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ وژن چھ نکات پر مبنی ہے:

1۔ تجارت اور سرمایہ کاری میں اضافہ اور اقتصادی خودمختاری کا تحفظ۔

2۔ نجی شعبے کو اقتصادی ترقی کا بنیادی ذریعہ بنانا۔

3۔ سڑکوں، شاہراہوں، ریلویز، بندرگاہوں، پانی، پن بجلی اور اس طرح کے دیگر شعبوں میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے حکومتی سرمایہ کاری۔

4۔ تمام شعبوں پر ترقی کی یکساں ذمہ داری ڈالنے کے لیے ٹیکسوں میں چھوٹ کے طریقے کار کا خاتمہ اور اس بات کو یقینی بنانا کہ سرکاری خدمات (Public Services) کی لاگت کو وصول کیا جائے تاکہ ان خدمات کا تسلسل یقینی رہے۔

5۔ حکومتی اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لینا اور انھیں دستیاب وسائل تک محدود رکھنا۔

6۔ آبادی کے کمزور اور غریب طبقات کو افراط زر کے اثرات سے بچانا اور اقتصادی اصلاحات سے پیدا ہونے والی بدحالی کے اثرات کم کرنے کے لیے انھیں نقد امداد مہیا کرنا''۔[2]

پہلا اور دوسرا نکتہ منڈی پر مبنی معیشت کے خدوخال واضح کرتا ہے لیکن اس میں ''اقتصادی خودمختاری کا لفظ'' بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا نکتہ پہلے دو مقاصد کو فروغ دینے کے عمل کا حصہ ہے۔ سرکاری شعبہ یوں نجی شعبے کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرتا ہے۔ چوتھا نکتہ ٹیکس کی وصولی کو وسیع اور یقینی بنانے کا ہے لیکن عوام کو تحفظ دینے والی مراعات سے ہاتھ اٹھا لینے کا بھی ہے۔ پانچواں نکتہ اگرچہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ایک قرض میں ڈوبے ہوئے ملک کی ضرورت بھی ہے اس سے ترقیاتی عمل (تیسرا نکتہ) کتنا متاثر ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غربت اس طرح کی ترقی کا لازمی حصہ ہے، بدحال عوام کے لیے ہمیشہ خیراتی اسکیمیں ہی رہ جاتی ہیں (چھٹا نکتہ)۔

یہ پورا کا پورا نیولبرل ایجنڈا ہے جو مسلم لیگ ن کے ایمان کا حصہ بن چکا ہے۔ ترقی کا یہ ماڈل جو 1995 میں ڈبلیو ٹی او کے بننے کے بعد عالمگیریت کے نعرے کے ساتھ دنیا پر چھا گیا، میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔[3] وہ متوسط طبقہ جو اس ترقی کے نتیجے میں وجود میں آیا وہ بھی اب پسنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اس لیے ہم اس طبقے کو آج ایک مزاحمتی انداز میں دیکھ رہے ہیں۔ ایسی مزاحمت بنیادی تبدیلی لانے کے قابل نہیں ہوتی۔ جسے ہم عرب اسپرنگ (Arab Spring) یعنی وہ ''انقلابات'' جو متوسط طبقے نے مشرق وسطیٰ میں برپا کیے کی ناکامی کی صورت میں دیکھ چکے ہیں۔ پاکستان کے تناظر میں پنجاب اور خیبر پختون خواہ حکومتوں کا بجٹ وژن بھی اسی نظریے کی ترجمانی کرتا ہے۔ پنجاب کے کچھ بجٹ اہداف مندرجہ ذیل ہیں:

- جی ڈی پی کی آٹھ فیصد سالانہ ترقی یا بڑھوتری۔
- نجی شعبے کی سرمایہ کاری کو آٹھ سے 17.5 بلین ڈالرز تک لے جانا۔
- ملینیم ترقیاتی اہداف (ایم جی ڈیز) کو حاصل کرنا۔
- برآمدات کے ذریعے ترقی اور برآمدات میں 15 فیصد اضافہ کرنا۔
- پیداوار میں اضافہ۔
- ایک ملین افراد کو ہر سال روزگار فراہم کرنا اور 2,000,000 افراد کو تکنیکی تربیت فراہم کرنا اور مختلف علاقوں کی ترقی میں ناانصافی کو دور کرنا۔[4]

خیبر پختون خواہ حکومت کے فنانس سیکرٹری خزانہ بجٹ وائٹ پیپر کے ابتداء میں لکھتے ہیں کہ:

''خیبر پختون خواہ کی حکومت نے اسٹریٹجک ڈیولپمنٹ پارٹنر شپ فریم ورک (SDPF) کو اپنایا ہوا ہے۔ یہ اس پالیسی کا نتیجہ ہے کہ جس کا مقصد امداد دینے والے ممالک اور صوبائی حکومت کے درمیان اصلاحی ایجنڈے پر ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ صوبائی حکومت نے میڈیم ٹرم ڈیولپمنٹ پلان (MTDP) کے تحت حقوق پر مبنی ترقیاتی طریقہ کار اپنایا ہوا ہے''۔[5]

پاکستان کے وفاقی بجٹ کی طرح صوبے بھی عالمی مالیاتی اداروں سے لیے گئے قرضوں

کی واپسی، ایم جی ڈیز کو حاصل کرنے اور منڈی پر مبنی معیشت کے نفاذ کو ممکن بنانے کے لیے انہی کے بتائے گئے ''یقینی طور پر اہداف کے حصول'' (output based) پر مبنی درمیانی مدت کے ترقیاتی منصوبے (MTDP) بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے کی ابتداء شوکت عزیز / مشرف دور سے ہوئی۔ اس طریقہ کار کو پہلے وفاقی حکومت نے اپنایا۔ اب صوبے مرحلہ وار اسے نافذ کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ خیبر پختون خواہ نے ''نہایت تیزی اور ایمانداری'' سے اس طریقہ کار کو مکمل طور پر اپنا لیا ہے۔

سندھ اور بلوچستان کی حکومتیں بھی اگرچہ منڈی پر مبنی معیشت کے فروغ کے لیے دیگر صوبوں کی طرح اصلاحات کر رہی ہیں لیکن ان کے بجٹ وژن میں کافی مماثلت نظر آتی ہے جس کی وجہ دونوں حکومتوں کی ترقی پسند سوچ ہے۔ مثلاً سندھ کے وزیر اعلیٰ اپنی بجٹ تقریر میں اس کا یوں اشارہ کرتے ہیں:

''... عالمی معیشت ابھی بھی مسلسل مندی [recession] سے نکلنے کی کوشش میں ہے اور معاشی بڑھوتری کے اہداف دنیا کے اکثر حصوں میں حاصل کرنا ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ ان مشکل حالات میں ہمیں اپنے لوگوں سے قریب رہنا ہے، لوگ جن کی جمہوری عمل میں بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ سماجی اور معاشی ترقی کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے بجٹ میں وسائل کا بہترین استعمال کریں گے ...''۔[6]

وزیر اعلیٰ بلوچستان کے مشیر خزانہ نے بجٹ وائٹ پیپر کی ابتدا میں بجٹ وژن پر یوں اظہار کیا:

''پیداواری قوتوں کو متحرک کرنے اور لوگوں کے بہبود کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ اگر انصاف پر مبنی وسائل کی تقسیم کو معاشی بڑھوتری سے الگ کر کے صرف ترقی پر زور دیا جائے جیسا کہ بلوچستان میں طویل عرصے سے کیا جا رہا تھا تو نتیجے میں جمود اور سیاسی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ معاشرے کے کمزور طبقے سیاسی استحکام کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ہم معاشرے کی تمام ضرورتوں کو اپنے محدود ذرائع سے پورا نہیں کر سکتے لیکن ترقیاتی شعبے کے لیے مختص کی گئی رقم میں توازن لانا ضروری ہے تاکہ آئندہ کا سماجی ڈھانچہ بنایا اور چلایا جا سکے''۔[7]

یوں تو اسحاق ڈار نے بھی عوامی انداز میں اپنی بجٹ تقریر کا اختتام اس شعر پر کیا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ہر فرد کو ملت کے مقدر کا ستارہ بنانے کے لیے معاشرے کو معاشرتی اور سماجی انصاف کے جس کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اس کے لیے عوام ہی کو آگے آنا پڑے گا اور اپنی طاقت استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کی بظاہر قبولیت نظر آتی تو ہے کیونکہ سندھ کے وزیر اعلیٰ کی بجٹ تقریر کے آغاز میں سماجی انصاف کے مطلب کو بھٹو کے اس بیان سے واضح کیا گیا:

''یا تو طاقت لوگوں تک پہنچائی جائے یا پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا''۔[8]

وفاقی بجٹ میں آمدنی کے تخمینے

ہمارے جیسے ملک میں جہاں آدھی سے زیادہ آبادی غربت میں پس رہی ہے اور جہاں دولت مندوں کو ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے ان پر ٹیکس کا بوجھ کم ڈالا جائے[9] تو وہاں حکومتی آمدنی کہاں سے آئے گی؟ یہاں دو طریقے کار نظر آ رہے ہیں یا تو پاکستانی بیرون ملک جا کر اپنے خون پسینے کی آمدنی وطن واپس بھیج کر ملکی بجٹ کو قیمتی زرمبادلہ کما کر دیتے ہیں یا دوسرا طریقہ بل واسطہ ٹیکسوں کا ہے۔ ٹیکس دو طرح کے ہوتے ہیں: بلا واسطہ ٹیکس (direct tax) جو سالانہ آمدنی کی ایک خاص حد کے بعد فرد واحد یا ادارہ، حکومت یا ٹیکس وصول کرنے والے ادارے کو براہ راست ادا کرتا ہے۔ یہ ٹیکس جائیداد یا پھر دیگر اثاثوں پر بھی دیا جاتا ہے۔ بل واسطہ ٹیکس (indirect tax) جو مصنوعات، خدمات وغیرہ پر لاگو ہوتا ہے جن کا بوجھ تمام افراد کو یکساں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ غریب اکثریت پر مہنگائی کے بم کی شکل میں گرتا ہے مگر امیروں کی عیاشی کی زندگی میں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس صورت حال میں تجارت جسے عالمی سطح پر ترقی کا محور سمجھا جاتا ہے کا کیا کردار ہے؟ تجارت زرمبادلہ کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن منڈی پر مبنی معیشت کی دو دہائیوں کی داستان بتاتی ہے کہ کارپوریٹ طاقت میں بے تحاشہ اضافے کے ساتھ اس نے بڑے پیمانے پر عالمی غربت کو فروغ دیا ہے۔ غریب ممالک میں جہاں برآمدات کم اور درآمدات زیادہ ہوتی ہیں تو تجارتی توازن کو ٹھیک رکھنے کے لیے آئی ایم ایف اور ترقیاتی منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے عالمی بینک جیسے اداروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یعنی امیر ممالک سے امداد کے علاوہ انہی عالمی امدادی اداروں کی طرف رجوع کرنا پھر ناگزیر ہو جاتا ہے۔

وفاقی بجٹ 2014-15 میں اندرونی اور بیرونی وسائل سے حاصل آمدنی کا تخمینہ 4,073,839 ملین روپے ہے کل آمدنی میں سب سے زیادہ رقم ٹیکس سے حاصل آمدنی (2,225,322 ملین روپے) کی ہے یعنی 54.6 فیصد، جو پچھلے سال ٹیکس سے حاصل آمدنی (2,183,807 ملین روپے) سے دو فیصد زیادہ ہے۔[10] بانڈ حصص نجکاری سے حاصل ہونے والی آمدنی (Capital Receipts) سرکاری وسائل کا دوسرا بڑا ذریعہ ہیں جن سے اس بجٹ میں حاصل رقم کا تخمینہ 690,618 ملین روپے ہے۔ سال 2013-14 بجٹ سے صوبوں میں جو رقم (خرچ نہ کر سکنے کی بنا پر) وفاق کو واپس کی وہ 183,045 ملین روپے تھی۔ 2014-15 کے بجٹ میں اس کا تخمینہ 289,289 ملین روپے ہے۔[11]

ہم جب ٹیکسوں کے حساب کتاب کو دیکھتے ہیں تو دو طرح کی فہرست نظر

آتی ہے۔ یعنی وہ ٹیکس جو فیڈرل بیورو آف ریونیو (FBR) وصول کرتا ہے اور دیگر ذرائع سے حاصل ٹیکس۔ FBR (ایف بی آر) دو طرح کے ٹیکس وصول کرتا ہے: بلاواسطہ ٹیکس جس میں انکم ٹیکس سے حاصل آمدنی سب سے زیادہ ہوتی ہے جس کا تخمینہ اس سال 1,180,000 ملین روپے ہے۔ بلواسطہ ٹیکسوں میں سیلز ٹیکس سے حاصل آمدنی (1,171,000 ملین روپے) کا تخمینہ سب سے زیادہ ہے جبکہ کسٹم ڈیوٹیز (281,000 ملین روپے) اور ایکسائز ٹیکس (171,000 ملین روپے) ملا کر بھی سیلز ٹیکس کی برابری نہیں کرتے۔[12] ایف بی آر کے علاوہ دیگر ٹیکسوں میں گیس انفرا اسٹرکچر ڈیولپمنٹ سس (GIDC) سے سب سے زیادہ آمدنی (145,000 ملین روپے) حاصل کرنے کا تخمینہ ہے۔ اس کے بعد پیٹرولیم لیوی (petroleum levy) سے آمدنی ہوتی ہے (123,000 ملین روپے)۔ سیلز ٹیکس اور GIDC (جی آئی ڈی سی) میں اضافہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ وہ ذرائع ہیں جن سے عوام پر براہ راست بوجھ مہنگائی میں اضافے کی صورت میں ڈالا جارہا ہے۔ جی آئی ڈی سی کا اطلاق گیس کے گھریلو صارفین پر نہیں ہوگا۔ اس سرچارج کا اطلاق مصنوعی کھاد کی کمپنیوں، سی این جی اسٹیشنوں، صنعتی شعبے، ماری گیس کمپنی لمیٹڈ، پاکستان پیٹرولیم لمیٹڈ اور نجی پاور پلانٹس (IPPs) پر ہوگا۔ جس سے حاصل شدہ آمدنی گیس درآمد کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر پر خرچ کی جائے گی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کے اس سے مہنگائی مختلف سطح پر بڑھے گی کیونکہ ایک طرف نقل وحمل کے تمام ذرائع مہنگے ہو جائیں گے جو بذات خود مہنگائی کا ایک ذریعہ ہے اور اس کے علاوہ دیگر نجی شعبہ اپنے اوپر پڑنے والے ٹیکس ادائیگی کے بوجھ کو عوام پر ڈالنے میں دیر نہیں کریں گے۔

جدول 1: امداد کے ذرائع

دیگر امداد	ملین روپے
اسلامک ڈیولپمنٹ بینک	49,500
یورو بانڈ	49,500
سکوک بانڈ	49,500
چائنہ سیف ڈپازٹس	99,000
کل رقم	247,500

Source: Federal Budget 2014-15 *Budget in Brief,* Government of Pakistan, Finance Division, Islamabad, p.15

بیرونی وسائل سے حاصل آمدنی کا تخمینہ 868,610 ملین روپے ہے جس میں منصوبوں کے لیے بیرونی قرض کا تخمینہ 174,843 ملین روپے ہے جبکہ پروگرام کے لیے دی گئی رقم 201,464 ملین روپے ہے یعنی ترقیاتی منصوبوں کے لیے امداد کم ہے اور ''پروگرام امداد'' زیادہ ہے۔ پروگرام امداد وہ امداد ہے جو قرضوں کی واپسی اور معیشت کو منڈی سے جوڑنے کے لیے بجٹ اصلاحات کے لیے دی جارہی ہے۔ اس میں آئی ایم ایف کا امدادی پیکیج (جس کا ذکر آگے آئے گا) شامل ہے۔ امداد کے دیگر ذرائع میں اسلامک ڈیولپمنٹ بینک، یورو بانڈز اور چائنا سیف ڈپازیٹ شامل ہیں (جدول 1)۔ جن میں چائنہ سیف ڈپازیٹ سے حاصل رقم سب سے زیادہ (99,000 ملین روپے) ہے یعنی اس مد کا 40 فیصد ہے۔

بیرونی امداد (grants) یعنی جس کو قرضہ کی شکل میں نہیں بلکہ تحفے کے طور پر دیا جاتا ہے، کی مد میں نجکاری سے حاصل آمدنی بھی شامل کی گئی ہے اور یہ آمدنی سب سے زیادہ ہے (یعنی 198,000 ملین روپے)۔ امریکی امداد (کیری لوگر بل) کے ذریعے نظرثانی شدہ بجٹ میں 16,221 ملین روپے ملے جبکہ 2014-15 کے بجٹ تخمینے میں اس ذریعے سے 15,951 ملین روپے ملنا متوقع ہے۔ دیگر بیرونی امداد میں پروجیکٹ ایڈ گرانٹ (30,852 ملین روپے) شامل ہیں (جدول 1.1 ملاحظہ ہو)۔

جدول 1.1: بیرونی امداد (ملین روپے)

بیرونی گرانٹس	244,803
پروجیکٹ ایڈ گرانٹ	30,852
- فیڈرل گورنمنٹ	8,752
- خودمختار ادارے	550
- صوبے	21,551
نجکاری سے حاصل کردہ رقم	198,000
کیری لوگر	15,951

Source: Federal Budget 2014-15 *Budget in Brief,* p.15.

وفاقی اخراجات

بجٹ میں کل وفاقی اخراجات کا تخمینہ 4,301,745 ملین روپے ہے۔ اس میں جاری اور ترقیاتی اخراجات شامل ہیں۔ جاری اخراجات کا اصل تخمینہ 1,804,838 ملین روپے ہے، باقی 333,174 ملین روپے بیرونی قرض کی ادائیگی اور 1,325,232 ملین روپے سود کی ادائیگی کے لیے ہیں۔ اگر قرض اور اس پر سود کی ادائیگی کی رقوم کو ملایا جائے تو جاری اخراجات کا 49.9 فیصد صرف اس مد میں خرچ کیا جارہا ہے۔ موجودہ خسارے کو بینکوں سے 227,906 ملین روپے قرض لے کر پورا کیا جائے گا۔ ترقیاتی اخراجات کا تخمینہ 838.500 ملین روپے ہے۔ اس میں وفاقی ترقیاتی اخراجات، صوبوں کو دیے جانے والے قرضے اور امداد اور دیگر ترقیاتی اخراجات شامل ہوتے ہیں۔

بجٹ کے جاری (current) اخراجات یہ واضح کرتے ہیں کہ

- اندرونی قرضوں پر سود کی ادائیگی بیرونی قرضوں سے کہیں زیادہ ہے (جدول 2)۔

جدول 2: سود کی ادائیگی (ملین روپے)

کل سود کی ادائیگی	1,325,232
- اندرونی قرضوں پر سود کی ادائیگی	1,224,592
- بیرونی قرضوں پر سود کی ادائیگی	100,640

Source: Federal Budget 2014-15 *Budget in Brief*, p.22.

- پنشن (سول اور ملٹری)، دفاع، سول انتظامیہ کو چلانے اور وفاق کی طرف سے اداروں کو دی جانے والی گرانٹس میں نظر ثانی شدہ بجٹ (revised budget 2013-14) کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے۔
- پچھلے سال زرتلافی پر 323,000 ملین روپے خرچ ہوئے جبکہ موجودہ بجٹ میں اس مد میں 203,248 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔[13] ''بجٹ ان بریف'' کے زرتلافی کے باب سے پتہ چلتا ہے کہ واپڈا / پیپکو اور کے ای ایس سی کو دی جانے والی زرتلافی کافی کم ہوئی ہے جبکہ رمضان پیکیج اور پاسکو کی زرتلافی کی رقم میں اضافہ ہوا ہے۔[14] نیشنل سپورٹ پروگرام جس میں بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام اورنوجوانوں کے لیے پروگرام شامل ہیں کے لیے مختص رقم میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

جاری اخراجات میں دس مختلف شعبے آتے ہیں انہیں جدول3 میں دیکھا جاسکتا ہے:

جدول3: جاری اخراجات کے مختلف شعبے (ملین روپے)

شعبہ جات	بجٹ 2014-15
(1)۔ جنرل پبلک سروس	2,543,334
(2)۔ دفاع	700,148
(3)۔ امن و عامہ	86,450
(4)۔ اقتصادی امور	47,585
(5)۔ ماحولیاتی تحفظ	936
(6)۔ کمیونٹی اور رہائشی سہولیات	2,012
(7)۔ صحت	10,017
(8)۔ ثقافت	7,060
(9)۔ تعلیم	64,014
(10)۔ سماجی تحفظ	1,691
کل	3,463,245

Source: Federal Budget 2014-15, *Budget in Brief*, p.23.

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق وفاقی بجٹ میں سب سے زیادہ اخراجات (73.4 فیصد) سرکاری خدمات (General Public Services) پر آرہا ہے جس میں حکومت کی پوری دو شاخیں۔ انتظامیہ (Executive) اور مقنّنہ (Legislature) آتی ہیں۔ ان میں اقتصادی امور (جس میں قرضوں کی واپسی) اور خارجہ امور بھی شامل ہیں جن پر 2,119,013 ملین روپے اخراجات کا تخمینہ ہے۔

یہاں یہ بتاتے چلیں کہ جنرل پبلک سروس کے بعد بالترتیب دفاع، امن و عامہ، تعلیم اور پھر اقتصادی امور (Economic Affairs) آتے ہیں۔ اقتصادی امور میں زراعت بھی شامل ہے۔ زراعت کا محکمہ کیونکہ اٹھارویں ترمیم کے بعد صوبائی حکومت کے پاس چلا گیا، وفاقی اخراجات کے حوالے سے اس کی تفصیل ترقیاتی بجٹ کے حصے میں آئے گی۔ جاری اخراجات میں صرف حکومت چلانے کا حساب کتاب پیش کیا جاتا ہے۔ ترقیاتی کاموں کے لیے قومی سطح پر پبلک سیکٹر ڈیولپمنٹ پروگرام (PSDP) اورصوبائی سطح پر سالانہ ترقیاتی منصوبے (ADP) بنائے جاتے ہیں۔

پبلک سیکٹر ڈیولپمنٹ پروگرام(PSDP)

وفاقی پبلک سیکٹر ڈیولپمنٹ پروگرام (پی ایس ڈی پی) کے لیے بجٹ 2014-15 میں 525,000 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ نظرثانی شدہ بجٹ 2013-14 میں یہ رقم 425 ملین روپے تھی جبکہ اس کا تخمینہ 540 ملین روپے تھا۔ یعنی پچھلے مالی سال میں وفاقی ترقیاتی منصوبوں کے لیے تخمینے سے کم رقم ملی۔ اس سال پی ایس ڈی پی کی رقم نظر ثانی شدہ رقم سے زیادہ لیکن پچھلے سال کے تخمینے سے کم ہے۔ پی ایس ڈی پی کا ایک کا بڑا حصہ بیرونی قرضوں اور امداد سے پورا ہوتا ہے۔ اگر یہ امداد کسی وجہ سے کم ہوجائے یا رک جائے یا دیگر حکومتی وسائل سے تخمینے سے کم آمدنی حاصل ہوتو ترقیاتی کاموں کے لیے رکھی گئی رقم ہی متاثر ہوتی ہے۔

2013-14 کے بجٹ میں صوبوں کو قومی پی ایس ڈی پی سے 615,000 ملین روپے دیے جانے کا تخمینہ تھا لیکن دراصل انھیں نظرثانی شدہ بجٹ میں 389,720 ملین روپے ہی مل پائے۔ رواں مالی سال میں صوبوں کو 650,000 ملین روپے ملنے کا تخمینہ ہے۔ یوں کل قومی پی ڈی ایس پی کی رقم (650,000+525,000) 1,175,000 ملین روپے بنتی ہے۔[15]

وفاقی وزارتوں اور ڈوژن کی تعداد 39 ہے جن کے لیے وفاقی پی ایس ڈی پی میں 296 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ وہ وزارتیں اور ڈوژنز جن کے لیے سب سے زیادہ رقم مختص کی گئی ہے ان میں ترتیب وار پاکستان اٹامک انرجی کمیشن، (51,475 ملین روپے)، واٹر اینڈ پاور ڈوژن (پانی کا شعبہ) (43,427 ملین روپے)، ریلوے (39,566 ملین روپے)، منصوبہ بندی اور ترقی (اصلاحات کی ڈوژن) (32,878 ملین روپے)، صحت سے متعلق ڈوژن (27,015 ملین روپے)، امور کشمیر و گلگت بلتستان

ڈوژن (21,357 ملین روپے) اور ہائیر ایجوکیشن ڈوژن (20,069 ملین روپے) شامل ہیں۔ اس فہرست میں کافی نیچے قومی غذائی تحفظ و تحقیق کی ڈوژن بھی ہے جس کے لیے 1,071 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ یہ ڈوژن خوراک کے معاملات پر پالیسی سازی کرتا ہے، باقی زرعی معاملات کو اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد صوبے محکمہ زراعت اور دیگر محکموں کے ذریعے انجام دے رہے ہیں۔

دو کارپوریشنوں واپڈا (توانائی) اور نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے لیے وفاقی ترقیاتی بجٹ میں سب سے زیادہ رقم مختص کی گئی ہے۔ یعنی بل ترتیب 63,613 ملین روپے اور 111,563 ملین روپے۔ ایم جی ڈیز اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے لیے 12,500 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ گزشتہ مالی سال میں نئے ترقیاتی پروگرام پر 115,000 ملین روپے مختص کیے گئے تھے جبکہ اس سال ایسا کوئی پروگرام نہیں۔[16]

اوپر بتائے گئے اعداد و شمار سے حکومتی ترجیحات صاف ظاہر ہیں یعنی پہلے نمبر پر شاہراہیں آتی ہیں جن کے کل 74 منصوبوں پر 113,000 ملین روپے خرچ کرنے کا تخمینہ ہے۔ ان میں پاک چین اقتصادی راہداری (Pak-China Economic Corridor) کا منصوبہ سب سے بڑا ہے جو کاشغر اور گوادر کو موٹر ویز اور ریلوے کے ذریعے آپس میں ملائے گا۔ مالی سال 15-2014 میں صرف اس منصوبے کے لیے 49,000 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔[17] اس کے بعد توانائی اور پھر پانی کے منصوبوں کا نمبر آتا ہے۔ توانائی کے لیے 205,000 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔[18] ان بڑے منصوبوں میں پانی، نیوکلیئر توانائی، کوئلے اور سبز توانائی کے منصوبے شامل ہیں۔ کچھ بڑے منصوبوں کی فہرست مندرجہ ذیل جدول 4 میں پیش کی گئی ہے۔

جدول 4: توانائی کے بڑے منصوبے

منصوبے	میگاواٹ
1۔ دیامیر بھاشا ڈیم	4,500
2۔ داسو ہائیڈرو پاور پروجیکٹ	4,500
3۔ مظفر گڑھ اور جامشورو پاور پروجیکٹ کی کوئلے پر منتقلی	3,120
4۔ کراچی کوٹسل پاور کے دو منصوبے	2,200
5۔ تربیلا چوتھا توسیعی منصوبہ	1,400
6۔ اینگرو کا تھر میں کوئلے سے چلنے والا منصوب o	1,200
7۔ نیلم جہلم منصوبہ	969

بحوالہ: وفاقی وزیر خزانہ اسحاق ڈار بجٹ تقریر، صفحہ 24

وفاقی حکومت کے 100 سے 747 میگاواٹ تک کے چھوٹے بڑے تقریباً آٹھ منصوبے اور بھی ہیں۔

پانی حکومتی ترجیحات میں تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ اس میں بھی سب سے بڑا منصوبہ دیامیر بھاشا ڈیم کا ہے جس میں 4.7 ملین ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ اس سال اس منصوبے کی زمین حاصل کرنے کے لیے 10,000 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ پانی کے منصوبوں میں دوسرے نمبر پر بلوچستان میں پانی کے منصوبے آتے ہیں۔ ان منصوبوں میں Flood Dispersal Structures اور "Delay Action Dams" ہیں جو کہ سیلابی پانی سے نمٹنے کے لیے تعمیرات ہیں۔ اس کے علاوہ نہروں اور چھوٹے ڈیموں کی تعمیر کی جائیگی اور وہ منصوبے جو پہلے ہی کافی تاخیر کا شکار ہیں ان کی تکمیل کی جائے گی۔ سندھ، پنجاب اور خیبر پختون خواہ کے منصوبوں کی تفصیل وفاقی وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر میں پیش کی گئی وہ یوں ہے۔

> سندھ میں رینی کینال (گھوٹکی اور سکھر) اور رائٹ بینک آؤٹ فال ڈرین (RBOD) کی سہون شریف سے سمندر تک توسیع کے منصوبوں پر سرمایہ کاری کی جائے گی۔ پنجاب میں گھبیر ڈیم (چکوال) اور آزاد جموں و کشمیر میں منگلا ڈیم کی سطح بلند کرنے کے لیے منصوبے کے لیے فنڈ مختص کیے گئے ہیں۔ خیبر پختون خواہ میں پلال، کنڈال اور صنم ڈیمز اور فاٹا میں کرم تنگی ڈیم (جنوبی وزیرستان) کے لیے بھی رقم مختص کی گئی ہیں۔ پنجاب، سندھ اور خیبر پختون خواہ میں سیلاب سے تحفظ اور پانی کے زیاں کو روکنے کے لیے کھالوں کی پختگی اور ملک بھر میں نکاسی آب کے منصوبے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پانی کے شعبے میں چند نئے منصوبے بھی شروع کیے جارہے ہیں جن کے تحت بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں بہت سے چھوٹے ڈیم بنائے جائیں گے۔[19]

زراعت

تین بنیادی حکومتی ترجیحات کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم زراعت کی طرف آتے ہیں جو ترجیحات کی فہرست میں کافی نیچے ہے اور وفاقی حکومت کی دلچسپی اس میں برآمدات بڑھانے کے حوالے سے واضح نظر آتی ہے۔ زراعت کا محکمہ چونکہ صوبائی حکومتوں کو منتقل ہوگیا ہے اس لیے وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں صوبوں کو باور کرایا کہ ''وہ اس سلسلے (زراعت کے ذریعے برآمدات بڑھانے) میں اپنا کردار ادا کریں''۔[20]

قومی غذائی تحفظ اور تحقیق کی وزارت خود بھی غذائی تحفظ کے لیے حکمت عملی تیار کرنے اور زرعی تحقیق کے معاملات پر صوبوں سے مکمل رابطے میں رہتی ہے۔ زرعی ترقی کی قومی پالیسی بنانے کے لیے وفاقی حکومت نے قومی غذائی تحفظ کونسل بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کونسل پیداوار میں اضافے، زرعی منڈی کی اصلاحات، ویلیو ایڈیشن (یعنی ایسی زرعی مصنوعات کی پیداوار جن کی قدر و قیمت زیادہ ہو) اور قیمتوں کے استحکام کے لیے پالیسی وضع کرنے کے لیے تمام صوبوں کے درمیان رابطے کا کام کرے گی۔ یعنی زرعی پالیسی کے حوالے سے وفاقی حکومت صوبوں کو اپنے زیر دست رکھتی ہے۔

پیداوار میں اضافے اور برآمدات کے فروغ کے حوالے سے وزیر خزانہ

نے اپنی بجٹ تقریر میں ٹیکسٹائل پیکیج کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکسٹائل کا شعبہ ہماری برآمدات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم انہوں نے کہا ''کپاس کی فصل اچھی نہ ہونے، اچھے بیجوں کے متعارف نہ کرائے جانے، بی ٹی کپاس کی منظوری نہ دیے جانے، بجلی اور گیس کی کمی، مقامی محصولات کی زیادتی، قرضوں پر بلند شرح سود اور درآمد کرنے والے ممالک کی پالیسیوں کی بنا پر ہمارے ٹیکسٹائل شعبے کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی ہے''۔21

یورپی یونین کی طرف سے جنرل سسٹم آف پریفرنس پلس (GSP+) کی سہولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے ٹیکسٹائل کے شعبے کے لیے مراعات کے اعلان کے ساتھ انہوں نے کہا:

''بی ٹی کاٹن [جینیاتی کپاس] کو فروغ دینے کے لیے ضروری ضوابط کی منظوری (Regulatory Approvals) دی جائیں گی۔ معیاری بیج کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے سیڈ ایکٹ 1976 میں ترامیم کی جائیں گی اور پلانٹ بریڈرز رائٹس بل Plant Breeders Rights' Bill جلد سے جلد متعارف کرایا جائے گا''۔22

زرعی ترقی کے لیے ترغیبی منصوبہ بھی بجٹ کا حصہ ہے جس کے نکات مندرجہ ذیل ہیں:

- حکومت نے چھوٹے کسانوں کو قرضے فراہم کرنے کے لیے گارنٹی اسکیم بنائی ہے تاکہ بینکوں کو زرعی قرضے دینے پر آمادہ کیا جاسکے۔ حکومت اسٹیٹ بینک کے ساتھ مل کر کمرشل اور مائیکرو فنانس بینکوں کو 50 فیصد نقصان کی شراکت داری کی گارنٹی فراہم کرے گی۔ اس اسکیم کے تحت پانچ ایکڑ نہری اور 10 ایکڑ بارانی زمین کے مالک کسانوں کو قرضے مل سکیں گے۔ اس اسکیم کے تحت کل 30,000 ملین روپے کے قرضے دیے جائیں گے۔

- قدرتی آفات، موسمی تبدیلیوں اور بیماریوں کی وجہ سے مختلف فصلوں کو تباہی سے بچانے کے لیے اس وقت 12.5 ایکڑ تک زمین رکھنے والے کسانوں کے لیے بیمے کا پروگرام جاری ہے۔ اس بجٹ کے ذریعے اس پروگرام کا دائرہ 25 ایکڑ زمین رکھنے والے کسانوں تک پھیلایا جارہا ہے۔ پانچ بڑی فصلوں کے لیے قرضہ لینے والے اس اسکیم سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جس کے لیے بجٹ میں 2,500 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

- چھوٹے کسانوں کے مویشیوں کو لاحق خطرات سے بچانے کے لیے حکومت نے مویشیوں کی بیمہ پالیسی تیار کی ہے جس میں 10 مویشی تک رکھنے والے کسانوں کو مدد فراہم کی جائے گی۔ اسکیم کے تحت آفات اور بیماریوں کے خلاف بیمہ مہیا کیا جائے گا۔ موجودہ بجٹ میں اس منصوبے کے لیے 300 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

- ٹریکٹروں پر سیلز ٹیکس جو یکم جنوری 2014 کو 16 فیصد کردیا گیا تھا اس اضافے سے مقامی طور پر بنائے جانے والے ٹریکٹروں کی خریداری بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس لیے زراعت میں ٹریکٹروں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے سیلز ٹیکس کی شرح 10 فیصد پر برقرار رکھنے کی تجویز دی جارہی ہے۔

- موجودہ اور مستقبل میں بننے والے گوداموں (storage facilities) کو مدد فراہم کی جائے گی اور ان کے کاروباری لین دین کے انتظام کے لیے ایک ضابطی ڈھانچہ (regulatory framework) بھی بنایا جارہا ہے۔ پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ کے ذریعے ایک کمپنی بنانے کے لیے 1,000 ملین روپے کی سرمایہ کاری کی جائے گی۔ علاوہ ازیں اسٹیٹ بینک آف پاکستان گودام اور کولڈ چین (اشیاء کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے سہولیات) کے لیے لمبی مدت کے قرضے بھی فراہم کرے گا۔

- پچھلے سال کے زرعی قرضہ جات کے 315,000 ملین روپے ہدف کے مقابلے رواں مالی سال حکومت نے اس مد میں 380,000 ملین روپے فراہم کیے ہیں۔ اگلے مالی سال یعنی 2014-15 میں اسے مزید بڑھا کر 500,000 ملین روپے کیا جارہا ہے۔

- مکران ڈویژن، گلگت بلتستان، ضلع سوات اور فاٹا میں پروسیسنگ کے منصوبوں کی مدد کے لیے خصوصی اسکیم بنائی گئی ہے جس میں پاکستان میں تیار نہ ہونے والی مشینری درآمد کرنے پر ڈیوٹی پر چھوٹ حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ اسٹیٹ بینک کے ذریعے لمبی مدت کے قرضوں کی سہولت بھی ملے گی اور مقامی پھلوں کے پراسیسنگ پلانٹ کو پانچ سال کے لیے ٹیکس سے استثنیٰ حاصل ہوگا۔

- گلگت بلتستان سے پھولوں اور پھلوں کی ہوائی جہاز کے ذریعے نقل وحمل کے لیے 50 فیصد مراعات دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔23

تبصرہ

اگر ہم بجٹ 2014-15 کے جاری اخراجات میں صرف جنرل پبلک سروس (جی پی ایس) کے اخراجات دیکھ لیں جو وفاقی بجٹ کا 73.4 فیصد بنتے ہیں اور پھر ان میں قرضوں کی ادائیگی کے بوجھ کو سمجھ لیں تو پتہ چل جائے گا کہ جی پی ایس، دفاعی اخراجات اور امن و عامہ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے ساتھ بجٹ 2013-14 میں کوئی ترقیاتی کام کیسے ممکن تھا اور مالیاتی سال 2014-15 میں کیسے ممکن ہوگا۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے وہ تجزیے بھی سامنے آرہے ہیں جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہماری معیشت کو اس وقت "3-D Paradox" (تھری ڈی پیراڈاکس) کا سامنا ہے24 یعنی قرضوں اور سود کی ادائیگی اور دفاعی اخراجات کی ضرورتوں سے وفاقی آمدنی کم ہے، لہٰذا ترقیاتی کاموں کے لیے خرچ کرنے کو کچھ نہیں۔ اقتصادی ماہرین کے مطابق حکومت نے اکنامک سروے 2013-14 اور مالی سال 2014-15 کے بجٹ اعداد و شمار سے بڑے پیمانے پر کھیلنے کی کوشش کی ہے۔25 حکومتی ترجیحات میں بھی

عجیب طرح کا شاہانہ پن نظر آتا ہے۔ جہاں عوام بھوک سے مر رہے ہوں، شاہراہوں کی تعمیر مغلیہ دور کی یاد دلاتی ہے۔ ''ترقی'' کا ڈھونگ رچایا جارہا ہے اور ترقی بھی وہ جو آئی ایم ایف کے ساتھ ایکسٹنڈڈ فنڈ فیسلٹی (Extended Fund Facilty) کی مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ ہو:

- سرکاری اداروں کی نجکاری، جن میں مسائل میں گرفتار پی آئی اے، اسٹیل ملز، پاکستان ریلوے اور دیگر اداروں کے ساتھ نہایت کامیابی سے چلنے والا ادارہ آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ اتھارٹی (OGDCL) بھی شامل ہے۔
- مراعات کا خاتمہ اور ٹیکسوں میں اضافہ۔
- نجی شعبے کے گردشی قرضوں کی ادائیگی۔
- ٹیکس کی چھوٹ کے خصوصی حکم ناموں کا خاتمہ (SROs)۔
- آمدنی اور اخراجات کے فرق کو 5.8 فیصد کی سطح پر لانا۔
- اسٹیٹ بینک کو خودمختار ادارہ بنانا۔
- ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قدر میں کمی۔
- آزاد تجارت کا فروغ۔
- غریب ترین اور متاثرہ لوگوں کو اس پروگرام کے اثرات سے بچانا۔[26]

حکومت سوائے اسٹیٹ بینک کی خودمختاری کے تمام شرائط پوری کرتی نظر آتی ہے تاکہ معیشت کی چار چار مہینوں کی نگرانی کے بعد آئی ایم ایف مطمئن ہو کر 6.64 بلین ڈالرز کے تین سالہ پروگرام کی ایک قسط پاکستان کو عنایت کرے۔ پچھلے 25 سالوں میں پاکستان نے آئی ایم ایف کے ساتھ 10 پروگراموں میں شمولیت اختیار کی لیکن عمل درآمد میں ناکامی کی وجہ سے فنڈز میں سے پاکستان کو زیادہ سے زیادہ 76 فیصد رقم ملی۔[27] آئی ایم ایف کے ساتھ تازہ معاہدہ صرف اس کے اپنے پچھلے قرضوں کی ادائیگی میں ''سہولت'' دینے کے لیے ہے۔ اپنی شرائط پر تبصرہ کرتے ہوئے خود آئی ایم ایف کا بیان ہے کہ ''معاشی ترقی اگلے سال توقع سے زیادہ خراب ہوگی ان سخت معاشی اقدامات کی وجہ سے جو 6.7 بلین ڈالرز کی امدادی قرض کے تحت کیے جائیں گے''۔[28]

ایسے پروگرام کے معیشت پر پڑنے والے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ ''معیشت کو مستحکم کرنے کا جو طریقہ اپنایا جارہا ہے یہ بنیادی اصلاحات کی گہری جڑوں سے توجہ ہٹا رہا ہے۔ معیشت کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ سروس سیکٹر سے زراعت اور صنعت کی طرف رخ کرے''۔[29]

پچھلے آٹھ سالوں میں گروس ڈومیسٹک پروڈکٹ (GDP) میں زراعت کا حصہ 23.0 فیصد سے 21.0 فیصد رہ گیا ہے، صنعتی شعبے کا 20.9 فیصد سے 20.8 فیصد ہے جبکہ خدمات کے شعبے میں ترقی 56.6 سے 58.1 فیصد ہوئی ہے۔[30] اس شعبے کو کم از کم آٹھ ذیلی شعبوں میں دیکھا جاسکتا ہے: آمد و رفت، مواصلات، تجارت، رہائشی خدمات، عام حکومتی خدمات (انتظامی اور دفاعی)، دیگر نجی خدمات، سماجی خدمات کے شعبے وغیرہ۔[31] اگرچہ خدمات کا شعبہ ملازمت فراہم کرنے کا بڑا ذریعہ ہے لیکن چونکہ بنیادی طور سے یہ شعبہ پیداواری نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے ذریعے ترقی حقیقی ترقی شمار نہیں کی جاسکتی۔ اگر ہم وفاقی بجٹ کے علاوہ صوبوں کے بجٹ دیکھیں تو ترجیحات میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً بلوچستان کے بجٹ میں یہ واضح طور سے بتایا گیا ہے کہ پلاننگ و ڈیولپمنٹ کے محکمے کی بتائی گئی حدود کے مطابق مختلف شعبوں کے لیے رقم مختص کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے بلوچستان کے بجٹ 15-2014 میں پیداواری شعبے کے لیے 11 فیصد، سماجی شعبے کے لیے 26 فیصد اور بنیادی ڈھانچے کے لیے 47 فیصد رقم مختص کی گئی۔[32] زرعی شعبہ جو بنیادی طور سے پیداواری شعبہ ہے کی سمت کو ہمارے صوبائی بجٹ جس طرح واضح کرتے ہیں ان کا ذکر نیچے کیا گیا ہے۔

پنجاب کے ''سیٹیزنز بجٹ'' یعنی شہریوں کے لیے بجٹ میں اس کا یوں ذکر ہے:

''حکومت کا مصمم ارادہ ہے کہ زرعی شعبے کو سائنسی بنیادوں پر جاندار اور عالمی سطح پر مربوط شعبہ بنائے جو نا صرف غذائی تحفظ کے مسئلہ کو پورا کرے بلکہ مقامی اور بین الاقوامی منڈی میں بھی مقابلہ کرسکے''۔[33]

خیبر پختون خواہ کے ''وائٹ پیپر'' میں زراعت پر توجہ کچھ یوں ہے:

''خیبر پختون خواہ کی معیشت زرعی معیشت ہے۔ ہماری 80 فیصد دیہی آبادی میں سے 70 فیصد بلا واسطہ یا بل واسطہ زراعت سے منسلک ہے۔ صوبے میں زراعت بڑی آسانی سے بڑی صنعت کا درجہ حاصل کرسکتی ہے اگر اسے مناسب توجہ اور سرپرستی ملے''۔[34]

سندھ کے وزیر اعلیٰ نے اپنی بجٹ تقریر میں زراعت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''معیاری بیجوں، مصنوعی کھاد اور زرعی مشینری کے ذریعے ہم اپنے کسانوں کو مدد فراہم کررہے ہیں''۔

''اس کے علاوہ زرعی شعبے کو عالمی بینک سے سندھ 'ایگری کلچر گروتھ پروجیکٹ' کے لیے 2.74 بلین روپے ملیں گے''۔[35]

مندرجہ بالا منصوبے کے تحت سندھ میں زراعت اور مال مویشی کے شعبوں میں چھوٹے کسانوں اور چھوٹے، درمیانے درجے کے گروہوں کو امداد فراہم کی جائے گی تاکہ وہ (1) کاشتکاری کے بہتر طریقے اپنائیں، (2) جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ویلیو اڈیشن اور پیداوار بڑھا سکیں اور (3) منڈی تک رسائی حاصل کرسکیں۔[36]

زراعت کو ''صنعت'' بنانے میں ہم ان چند عالمی کمپنیوں کے لیے کام کررہے ہیں جو زیادہ پیداوار والے ہائبرڈ اور جینیاتی بیجوں اور ان سے جڑے زرعی مداخل کے کاروبار کے ذریعے دنیا بھر کی زراعت کو اپنے قبضے میں کیے بیٹھی ہیں۔ ماحول اور خوراک کو زہر آلود کرکے، انسانی صحت کے لیے نئے نئے خطرات پیدا کرکے اور کسانوں کو بدحال بنا کر وہ صرف اپنے منافع کے لیے کام کرتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پیداوار تجارت کی

ضرورت ہے کیونکہ منڈی میں جب ایک شئے زیادہ آجاتی ہے تو اس کے دام گرتے ہیں اور فائدہ انہی کمپنیوں کو ہوتا ہے جو عالمی منڈی میں سستے خام مال اور اور سستی اشیاء کی تلاش میں رہتی ہیں تاکہ وہ اپنے منافع کی شرح بلند رکھ سکیں۔ مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو زرتلافی کے ذریعے قابل برداشت بنانے کے بجائے بیمہ کمپنیوں اور مائیکرو کریڈٹ کے کاروبار کے فروغ کا جال بچھایا جارہا ہے۔ اسی طرح کی فہرست میں سرد خانوں کا قیام، قدر زائد (ویلیو ایڈیڈ) اشیاء کا فروغ اور ایسے تمام عوامل شامل ہیں جو زراعت کو تجارت سے جوڑتے ہیں تاکہ تجارت معیشت کا پہیہ بن سکے۔ معیشت کے حقیقی پیداواری شعبے یعنی زراعت اور صنعت جنہیں ڈبلیو ٹی او کے قیام سے پہلے جو کچھ تحفظ حاصل تھا اسے اب ختم کیا جارہا ہے۔ انہیں اب صرف عالمی منڈی میں بڑی مچھلیوں کے لیے چھوٹی مچھلیوں کا کام کرنا ہے۔ ایسے حالت میں ملکی ترقی اور خوشحالی ایک خام خیال ہے۔

دراصل معیشت میں ''استحکام'' کو یقینی بنانے کے لیے ہماری حکومتیں اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے ہاتھ اٹھارہی ہیں۔ پبلک پرائیوٹ پارٹنرشپ کا وسیع ہوتا جال اور قیمتی سرکاری اثاثوں کو نجی شعبے کے حوالے کرنے کے پروگرام اس کی ایک مثال ہیں۔ پاکستانی نجی شعبہ توانائی کے بحران کی وجہ سے خود اپنے آپ کو سنبھال نہیں پارہا۔ لے دے کر بیرونی قرضوں کا حصول اور بیرونی سرمایہ کاری کا فروغ رہ جاتا ہے۔ آزاد تجارت کی معیشت اس طرح کے فروغ کا نام ہے۔ ہماری حکومتیں کارپوریٹ شعبے کو متوجہ کرنے اور خوش رکھنے کے لیے انھیں مراعات کی ترغیب دیتی نظر آتی ہیں چاہے اس شعبے کے قدموں کے نشانات کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ موجودہ بجٹ میں بھی جہاں ٹیکس کے جال کو وسیع کرنے پر زور دیا گیا ہے وہاں کارپوریٹ ٹیکس کو کم کرنے کی سفارشات بھی ہیں۔[37] پاکستان جیسے زرعی ملک میں جہاں آبادی کی اکثریت زراعت سے جڑی ہے مونسانٹو جیسی دیوہیکل امریکی کمپنی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے سیڈ ایکٹ 1976 میں ترامیم اور پلانٹ بریڈرز رائٹس کا بل قومی اسمبلی میں پیش کیا جارہا ہے۔ بیج پر قانون سازی صوبائی حکومت کے دائرا اختیار میں آتا ہے لیکن اس معاملے میں چاروں صوبائی حکومتیں یہ اختیار پہلے ہی وفاقی حکومت کو دے چکی ہیں۔ حکومت اس عوام دشمن، کسان دشمن اور ماحول دشمن اقدام سے اپنی بے حسی اور سنگدلی کے ساتھ لاعلمی کا ثبوت بھی دے رہی ہے۔ کیا اسحاق ڈار کو معلوم نہیں کہ جینیاتی فصلوں کی مخالفت میں یورپ میں کیا فیصلے ہورہے، کیا انھیں معلوم نہیں کہ جب عالمی معیشت مندی کا شکار ہے اور دنیا موسمی تبدیلی کے بحران سے گزر رہی ہے، عالمی تجارت کو ترقی کا محور نہیں سمجھا جاسکتا اور نہ ہی زیادہ سے زیادہ پیداوار پر زور دیا جاسکتا ہے۔ تمام حکومتوں کو اس وقت ایک موقع حاصل ہے جس میں وہ اپنی معیشتوں کو ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے تصور کا تلاش کرسکتی جس میں عوام کا ترقی میں مرکزی کردار تسلیم کیا جائے تاکہ ترقی ایسے سایہ دار درخت کی طرح ہو جس کی جڑیں مضبوط اور توانا ہوں، ایسی ترقی ہی ماحول دوست اور پائیدار ہوتی ہے اور یہی ہماری منزل مقصود ہونی چاہیے۔ اس کی ابتداء زرعی زمین کی کسانوں میں منصفانہ اور مساویانہ تقسیم اور پانی کی مناسب فراہمی کے انتظام سے ہوسکتی ہے۔ ہمیں ترقی کے لیے آزاد تجارت نہیں، آزاد، خودمختار اور پائیدار زراعت چاہیے۔

حوالہ جات

1۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، اقتصادی امور، شماریات اور نجکاری، بجٹ تقریر 15-2014، صفحہ 2۔ حاصل کیا گیا www.finance.gov.pk.com. سے۔

2۔ ایضاً، صفحہ 2۔

3۔ آکسفیم کے ایک بریفنگ پیپر کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کے 85 امیر ترین لوگوں کے پاس اتنی دولت ہے جتنی دنیا کے آدھے غریب ترین افراد کے پاس ہے جن کی تعداد 3.5 بلین بنتی ہے۔ دنیا کی آبادی کے امیر ترین ایک فیصد کے پاس دولت کا تخمینہ 110 ٹریلین ڈالرز لگایا گیا ہے جو غریب ترین افراد کی کل آمدنی سے 65 گنا زیادہ ہے۔ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کی پالیسیاں اسی عالمی اشرافیہ کو مزید طاقت ور بنا رہی ہیں۔ امیر اور غریب میں یہ بڑھتا ہوا فرق آنے والے سالوں میں سب سے بڑا عالمی خطرہ ہے، یہ بات ورلڈ اکنامک فورم نے اپنی ایک رپورٹ (Outlook on the Global Agenda) میں بھی کہی ہے۔ سید محمد علی، دی ایکسپریس ٹریبیون، 21 فروری، صفحہ 6۔

4. Government of the Punjab, *The Citizen's Budget 2014-15*, p.7.

5. Syed Said Badshah Bokhari, *"Forward." White Paper 2014-15*, Finance Department, Government of Khyber Pukhtunkhwa.

6. Syed Qaim Ali Shah, Chief Minister Sindh, *Budget Speech*, Finance Department, Government of Sindh, p.2.

7۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار، بجٹ تقریر 15-2014، صفحہ 65۔

8. Syed Qaim Ali Shah, *Budget Speech*, p.1.

9. Ziauddin Ahmed. "Taxing the rich and powerful." *The Express Tribune*, 4 June, 2014, p.7.

10. *Budget in Brief*, Federal Budget 2014-15, Government of Pakistan, Finance Division, Islamabad, p.8.

11. Ibid., 11

12. Ibid, p.11.

13. Ibid., p.24.

14. Ibid., p.33.

15. Ibid., p.42.

16. Ibid.

17. "Suspicion shrouds PSDP." *The Express Tribune*, 4 June, 2014, p.1.

18۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار، بجٹ تقریر 15-2014، صفحہ 24۔

19۔ ایضاً، صفحہ 23۔

20۔ ایضاً، صفحہ 36۔

21۔ ایضاً، صفحہ 34۔

22۔ ایضاً، صفحہ 35۔

23۔ ایضاً، صفحات 39-36۔

24. Rana, Shahbaz, "Funds fall short when it comes to development." *The Express Tribune*, 24 November, 2014, p.10.

25. Khan, Ashfaque H. "State of the Economy." *The Express Tribune*, 10 October, 2014, p.6.

26. Khan, Ashfaque H. "IMF Programme." *The News*, 17 September, 2013, p.6.

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 37 میں دیکھیں)

بین الاقوامی امدادی ادارے یو ایس ایڈ کی پاکستان میں کارکردگی

تحریر: عذرا طلعت سعید

بین الاقوامی شراکت داری کے تحت پہلی دنیا کے ممالک تیسری دنیا کے لیے ترقیاتی امداد فراہم کرتے ہیں۔2005 میں منعقد ہونے والا بین الاقوامی سربراہی اجلاس ''سیکنڈ ہائی لیول فورم اون ایڈ افیکٹونس'' نے بین الاقوامی امداد دینے والے (ڈونز) اور لینے والے (ریسیپیئنٹ) ممالک کے لیے نئے اصول وضوابط مرتب کرنے کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ کانفرنس کا اعلامیہ ''پیرس ڈیکلریشن آن ایڈ ڈیولپمنٹ افیکٹونس'' کہلاتا ہے۔ اس مسودے نے ترقیاتی امداد دینے والے امیر ممالک اور امداد لینے والے غریب ممالک کے درمیان پانچ نکات پر مبنی ابتدائی ڈھانچہ پیش کیا۔ یہ پانچ نکات مندرجہ ذیل ہیں۔[1]

1۔ اپنانا یا تسلیم کرنا (ownership): یعنی امداد حاصل کرنے والے ممالک اپنی ترقیاتی پالیسیوں کو تشکیل دینے میں موثر قائدانہ صلاحیتوں کا استعمال کریں اور (قومی سطح پر) ترقیاتی عمل میں حصہ لینے والے دیگر گروہوں کو بڑے پیمانے پر مشاورتی عمل میں شامل کرتے ہوئے ترقی کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ اس ترقیاتی لائحہ عمل کو سالانہ بجٹ میں لازمی ہدف کے طور پر شامل کریں اور ان اہداف کے حصول کے لیے امداد دینے والے ممالک، سول سوسائٹی اور نجی شعبہ کی شمولیت کی حوصلہ افزائی کریں۔ دوسرے لفظوں میں امداد کا استعمال اس ترقیاتی لائحہ عمل کے لیے کیا جائے جسے حکومت اور دیگر گروہوں کی رضا مندی سے تیار کیا گیا ہو۔

2۔ الائنمنٹ (alignment) یعنی امداد فراہم کرنے والے ممالک اپنی مجموعی امداد کو امداد لینے والے ممالک کے ترقیاتی لائحہ عمل، ان کے اداروں اور ان کے ہاں رائج طریقوں کی بنیاد پر فراہم کریں۔ ''طریقوں'' سے مراد ہے سرکاری مالیاتی انتظامات کے لیے استعمال ہونے والے طریقے یا پھر حساب کتاب، وسائل، اشیاء حاصل کرنے کے طریقے اور دیگر۔

3۔ ہارمونائزیشن (harmonization): یعنی امداد فراہم کرنے والے ممالک امداد کی فراہمی میں پالیسی، ہم آہنگی، شفافیت اور موثر طریقوں کا استعمال کریں گے۔

4۔ مینجنگ فور رزلٹ (managing for results): یعنی امداد کے انتظام اور اسے استعمال کرنے کے طریقے نتائج کے حصول کے لیے ہوں اور ساتھ ساتھ ایسی معلومات استعمال کی جائیں کہ جو فیصلہ سازی میں بہتری لائیں۔ ایسا ڈھانچہ دیا تشکیل کی جائے جو نتائج پر مبنی رپورٹس اور دیگر شعبہ جات میں ترقیاتی لائحہ عمل کی کارکردگی کو جانچ اور ناپ سکے۔

5۔ میوچل اکاؤنٹبلیٹی (mutual accountability): یعنی امداد فراہم کرنے والے اور امداد لینے والے ممالک ترقیاتی نتائج کے لیے جوابدہ ہوں گے۔ دونوں ممالک ترقیاتی وسائل کے استعمال میں باہمی جوابدہی اور شفافیت کو فوقیت دیں گے۔ اس طرح قومی پالیسیوں اور ترقیاتی امداد کے لیے عوامی حمایت بھی مضبوط ہوتی ہے۔

ان پانچ نکات کا خلاصہ کچھ یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ترقیاتی امداد دینے اور لینے والے ممالک باہمی تعاون، احتساب اور ذمہ داری کے ساتھ کام کریں گے۔ کسی بھی ملک کی ترقیاتی پالیسی تشکیل دینے کے لیے حکومت نتائج کے حصول کو فوقیت دیتے ہوئے ترقیاتی عمل میں حصہ لینے والے تمام گروہوں کو شامل کرے۔ جس میں عوامی شمولیت کے ساتھ نجی شعبہ کی شراکت پر بھی زور دیا گیا ہے۔

پاکستان کو کئی ممالک امداد فراہم کر رہے ہیں۔ ان میں سے امریکی حکومت ایک اہم شریک ہے۔ یہ مضمون امریکی محکمہ برائے بین الاقوامی امداد (یو ایس ایڈ) کی پاکستان میں کارکردگی کا ایک جائزہ پیش کر رہا ہے جو اوپر بیان کیے گئے نکات کی روشنی میں اس کے کردار کو پرکھنے کی طرف ایک قدم ہے۔

پاکستان میں امریکی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی (یو ایس ایڈ USAID)

امریکی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقی ایک حکومتی ادارہ ہے جس کے ذریعے امریکی حکومت ترقی پذیر ممالک کو امداد فراہم کرتی ہے۔ یو ایس ایڈ 100 سے زائد ممالک میں کام کر رہا ہے۔ امریکہ اپنے مجموعی بجٹ کا ایک فیصد سے کم حصہ اس مقصد کیلئے خرچ کرتا ہے۔[2] یو ایس ایڈ کے بنیادی مقاصد میں مشترکہ اقتصادی خوشحالی، جمہوریت اور اچھی حکمرانی کو مضبوط بنانا، انسانی حقوق کی حفاظت کرنا، عالمی صحت کو بہتر بنانا، زراعت اور خوراک کے تحفظ، پائیدار ماحول، تنازعات، قدرتی اور انسان کی پیدا کردہ آفات سے نمٹنے کیلئے امداد فراہم کرنا شامل ہے۔[3]

پاک امریکہ تعلقات ساٹھ سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہیں۔ امریکہ کئی شعبوں میں پاکستان کو امداد فراہم کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 1959 سے 2011 کے دوران 67 بلین ڈالرز امداد کی مد میں پاکستان نے وصول کیے جس میں فوجی اور معاشی امداد شامل ہے۔ امریکہ سے آنے والی امداد میں تسلسل اور استحکام کی کمی دیکھی گئی ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی سالوں میں زیادہ تر معاشی امداد فراہم کی گئی۔ 1970 کی دہائی میں فوجی امداد دی ہی نہیں گئی جبکہ 1980 میں فوجی امداد جو کہ صفر تھی یکدم پانچ سو ملین ڈالرز کردی گئی۔ یہ امداد دراصل افغانستان میں سابقہ

سویت یونین سے جنگ کے لیے پاکستان کو فراہم کی گئی۔ 1980 کی دہائی میں پاکستان کو امریکہ سے ملنے والی کل فوجی اور اقتصادی امداد 1,100 ملین ڈالرز سے بھی تجاوز کر گئی۔ 2002 میں فوجی اور اقتصادی امداد 2,500 ملین ڈالرز سے شروع ہوتے ہوئے کافی اتار چڑھاؤ کے ساتھ 2009 میں نئے امدادی معاہدوں کے ساتھ 4,500 ملین ڈالرز تک جا پہنچی۔[4]

کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کو امداد

2009 میں امریکی حکومت نے پاکستان کو امداد فراہم کرنے کے لیے ایک نیا قانون انہانسڈ پارٹنرشپ ودھ پاکستان ایکٹ آف 2009 (Enhanced Partnership with Pakistan Act of 2009) منظور کیا۔ اس ایکٹ کو اکثر کیری- لوگر- برگمن بل بھی کہا جاتا ہے۔ جس کے تحت پاکستان کو 7.5 بلین ڈالرز 2010 سے 2014 کے پانچ سالہ دورانیے میں فراہم کرنے کی منظوری دی گئی۔ یہ امداد فوجی نہیں بلکہ خالصتاً ترقیاتی امداد ہے۔ 2002 سے 2009 کے درمیان امریکی امداد کا کل 30 فیصد معاشی استحکام سے جڑی ضروریات کے لیے اور باقی حفاظتی اقدام سے جڑے مسائل کے لیے دیا جارہا تھا۔[5] امریکی امداد کو اکثر پاکستان میں تنقیدی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ امداد کی فراہمی ہمیشہ امریکی مفادات کے پیش نظر بڑھتی اور کم ہوتی نظر آتی ہے۔ کیری لوگر بل میں بھی پاکستانیوں کے امریکہ کے لیے منفی خیالات کا خاص ذکر کیا گیا ہے اور اس کے سدباب کے لیے زور دیا گیا ہے کہ ''دونوں ممالک کے مابین مختلف سطحوں پر تعلقات استوار کیے جائیں تاکہ ایک قابل اعتبار، دیرپا شراکت داری قائم ہوسکے''۔[6]

کیری لوگر بل کے تحت اب تک تقریباً 4.4 بلین ڈالرز پاکستان کو دے دیے گئے ہیں جو 7.5 بلین ڈالرز کا 62 فیصد ہے۔ اس بل کے تحت 2010 سے 2014 تک ہر سال 1.5 بلین ڈالرز ملنے تھے جو سوائے ایک سال کے کسی بھی سال پورے ادا نہیں کیے گئے۔ ڈاکٹر آفریدی کے حوالے سے دونوں ممالک میں تنازعات بڑھ گئے ہیں۔ امریکی حکومت میں پاکستان کو دی جانے والی امداد کو ختم کرنے پر بحث و مباحثہ شروع ہوا تو سیکرٹری آف اسٹیٹ جان کیری کا کہنا تھا کہ'' مختلف وجوہات کی بنا پر ایسے وقت میں پاکستان کی امداد روک دینا مناسب اقدام نہیں ہوگا۔ ہم پاکستان کے ساتھ جوہری تحفظ اور عدم پھیلاؤ کے حوالے سے کام کررہے ہیں۔ ہم پاکستان کے ساتھ افغانستان کے اندر و باہر سپلائیز (supplies) کے لیے کام کررہے ہیں''۔[7]

کیری لوگر بل کے تحت یو ایس ایڈ پاکستان میں طویل المدت، مربوط منصوبوں پر پانچ شعبہ جات میں کام کررہا ہے جن میں توانائی، معاشی بڑھوتری، استحکام، تعلیم اور صحت شامل ہیں۔[8] ان پانچوں شعبوں میں باہمی تعلق (کراس کٹنگ) والے شعبہ جات یعنی اچھی حکمرانی (good governance)، صنفی مساوات اور بہتر شفافیت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں معاشی بڑھوتری کے حوالے سے شروع کیے گئے منصوبوں کو تفصیل سے پیش کیا جارہا ہے کیونکہ اس شعبے کی زیادہ توجہ زرعی ترقی پر رہی ہے جو پاکستان کا سب سے بڑا معاشی شعبہ ہے۔ پاکستان کی تقریباً 60 سے 65 فیصد آبادی دیہی ہے اور تقریباً 47 فیصد مزدور طبقہ اس شعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ معاشی بڑھوتری کے منصوبوں کی فہرست میں ایگری بزنس پروجیکٹ، اگری کلچر پالیسی پروجیکٹ، بلوچستان ایگری کلچرل پروجیکٹ، ڈیری پروجیکٹ، انٹرپرینیور پروجیکٹ، پاکستان فرمز پروجیکٹ، گومال زام آبپاشی پروجیکٹ، اناج ذخیرہ پروجیکٹ، سدپارہ آبپاشی پروجیکٹ اور تجارت پروجیکٹ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس شعبے میں تین منصوبے یو ایس ایڈ نے تین دیگر امریکی محکموں کو منتقل کردیے ہیں جن میں محکمہ برائے کامرس (ڈی او سی)، محکمہ برائے زراعت (یو ایس ڈی اے) اور محکمہ برائے تجارتی ترقی (یو ایس ٹی ڈی اے) شامل ہیں۔[9] یو ایس ایڈ نے معاشی بڑھوتری کے شعبے میں جو منصوبے شروع کیے ہیں ان میں سے کچھ کے بنیادی مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:[10]

> کیری لوگر بل کے تحت 2010 سے 2014 تک پاکستان کو ہر سال 1.5 بلین ڈالرز ملنے تھے جو سوائے ایک سال کے کسی بھی سال پورے ادا نہیں کیے گئے۔

- **ایگری بزنس پروجیکٹ**

اس پروجیکٹ کا مقصد ہورٹی کلچر (پھل اور پھول) اور مال مویشی سے متعلق مصنوعات کی قدر میں اضافے کے عمل (ویلیو چین) میں مقابلہ سازی (competition) کو فروغ دینا ہے تاکہ روزگار میں اضافہ ہو اور غربت میں کمی آسکے۔ ویلیو چین میں وہ تمام سرگرمیاں شامل ہیں جو کہ کسی شئے کی پیداوار، فروخت، تشہیر اور ترسیل کے لیے ضروری ہیں۔ اس پروجیکٹ کی کچھ چیدہ چیدہ کارکردگی مندرجہ ذیل ہے:[11]

برآمدات بڑھانے کے لیے پھل و سبزی، مال مویشی مصنوعات کی پیداوار اور برآمد کرنے والوں کی بین الاقوامی منڈی تک رسائی کے لیے وسائل فراہم کیے جارہے ہیں۔ اس حوالے سے ستمبر 2012 میں دس پاکستانی پھل اور سبزی کے برآمد کنندگان کو روس میں منعقد ہونے والی عالمی فوڈ ماسکو نمائش میں حصہ لینے کے لیے مدد فراہم کی۔ جس کی بدولت پھل اور پھول کی مصنوعات کی غیر ملکی منڈیوں میں ویلیو چین صلاحیتوں میں مضبوطی آئی ہے۔[12]

اس کے علاوہ یو ایس ایڈ ایگری بزنس پروجیکٹ رورل سپورٹ پروگرام اور این جی اوز کو امداد فراہم کرتا ہے تاکہ یہ تنظیمیں چھوٹے کسانوں کو منظم کرکے ویلیو ایڈیشن کی صلاحیت فراہم کریں۔ کاروبار کرنے کے لیے کسانوں کے منظم گروہوں کو فارمرز انٹر پرائز

گروپس (Farmer Enterprise Groups) کا نام دیا گیا ہے۔ ویلیو ایڈیشن میں خصوصاً غذائی مصنوعات اور دیگر زرعی مصنوعات کی تیاری، پیکنگ، محفوظ کرنا (اسٹوریج) اور مارکیٹنگ کی صلاحیت بڑھانا مقصود ہے۔ ویلیو ایڈیشن سے مراد ہے کہ جب کسی شئے کی ابتدائی شکل میں تبدیلی لائی جائے مثلاً گندم کو آٹے میں تبدیل کرنا اور آٹے کو روٹی میں تو ہر نئی تبدیلی بنیادی شئے کی قدر (value) یا قیمت میں اضافہ کرتی ہے۔

- ایگری کلچر پالیسی پروجیکٹ

یو ایس ایڈ کی ایک رپورٹ کے مطابق حکومت پاکستان کی درخواست پر یو ایس ایڈ نے انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (IFPRI) کے اشتراک سے چار سالہ معاہدے (2011-15) کے تحت زرعی پالیسی ریسرچ منصوبہ شروع کیا۔[13] اس منصوبے کا مقصد تھا کہ مقامی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے، پالیسی کے لیے فیصلہ سازی پر بہتر معلومات مہیا ہوں اور زراعت میں سائنس اور جدت (innovation) کو فروغ دیا جائے۔ منصوبے کے معاہدے میں لکھا گیا تھا اس منصوبے کا بنیادی ہدف ''شواہد پر مبنی پالیسی اصلاحات کرنے اور نافذ کرنے کی صلاحیت کو بہتر کیا جائے تاکہ غریبوں کے حق میں معاشی بڑھوتری اور تحفظ خوراک میں حصہ ڈالا جائے''۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے تین سرگرمیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ (i) پاکستانی محققین کی صلاحیتوں کو بڑھایا جائے تاکہ وہ پالیسی کا تجزیہ کر پائیں۔ (ii) پالیسی بنانے والے میں تنقیدی صلاحیتوں اور پالیسی پر کی گئی تحقیق کو استعمال کرنے کی صلاحیت کو بڑھایا جائے۔ (iii) حکومت کی ہر سطح پر اہم ترجیحات کی نشاندہی اور ان پر بحث و مباحثہ کے لیے مختلف گروہوں کو اکٹھا کیا جائے جن میں محققین، پالیسی ساز، سول سوسائٹی اور نجی شعبے کے اراکین شامل ہوں۔ اس منصوبے کے لیے چار مخصوص شعبہ جات کا انتخاب کیا گیا:

1۔ زرعی پیداوار۔
2۔ پانی کا انتظام اور آبپاشی۔
3۔ میکرو اکنامکس، منڈیاں اور تجارت۔
4۔ غربت میں کمی اور سماجی تحفظ کے لیے اقدامات (social safety nets)۔

IFPRI (افپری) اس ایگری کلچر پالیسی پروجیکٹ کو پاکستان اسٹراٹیجی سپورٹ پروگرام (PSSP) کے نام سے متعارف کررہا ہے۔ افپری کے مطابق PSSP (پی ایس ایس پی) چاہتا ہے کہ زراعت کے شعبے میں سرمایہ کاری اور کاروبار (enterprise) کے لیے ایک بہتر سازگار ماحول پیدا کیا جائے۔ افپری نے پالیسی سازی پر مختلف تصانیف جاری کی ہیں۔[14] جن میں سے ایک بیج کی صنعت پر ہے۔[15] اس تحقیق میں جو مشورے فراہم کیے گئے ان میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں:

a۔ بیج کے شعبے کے لیے ضوابط کے ڈھانچے کا ازسرنو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ بیج کی منڈی جو مقابلہ سازی کی فضاء میں بہتر کارکردگی پیش کررہی ہے اور کئی مختلف (بیج فراہم کرنے والے) گروہ موجود ہیں تو ان حالات میں کسانوں کو یہ آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق بیج کا چناؤ کریں۔ حکومت کی ذمہ داری یہ ہونی چاہئے کہ وہ (بیج) کے حوالے سے معیار اور مخصوص حوالہ جات فراہم کرے اور پھر یقینی بنائے کہ حکومت کے فراہم کردہ معیار اور حوالہ جات کو اپنایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا سازگار ماحول مہیا کرے جس کے تحت معیار کے مطابق بیج کی تصدیق کرنے کے لیے خدمات پیش (accreditation services) کی جاسکیں۔

> افپری کے مطابق پاکستان فیڈرل سیڈ سرٹیفیکیشن اور رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ غیر ضروری ہے۔ افپری کا یہ بھی کہنا ہے کہ پنجاب سیڈ کارپوریشن کو بند کردیا جائے۔

b) پاکستان کو فیڈرل سیڈ سرٹیفیکیشن اور رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ (FSC&RD) کے کردار کو بھی دوبارہ سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الوقت یہ ادارہ جو کام کرتا ہے یعنی بیج کی رجسٹریشن اور سرٹیفیکیشن (سند)، دونوں غیر ضروری ہیں۔ (رپورٹ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی کہ اس ادارے کا نیا کردار کیا ہونا چاہیے)۔

c) پنجاب سیڈ کارپوریشن کو بند کردیا جائے یا پھر اس کو اپنی توجہ مخصوص اور نظر انداز کردہ منڈیوں کے لیے بیج کی پیداوار پر مرکوز کرنی چاہیے۔

- بلوچستان ایگری کلچرل پروجیکٹ

منصوبہ بلوچستان کے اضلاع قلعہ سیف اللہ، لورالائی، مستونگ، کوئٹہ، ژوب، موسیٰ خیل، پشین اور شیرانی جو افغانستان کی سرحد سے متصل ہے میں نافذ کیا جارہا ہے۔ اس پروجیکٹ کے دیگر مقاصد میں شامل ہے:

- 700 آبادیوں کے 14,300 ضرورت مند کسانوں کی پیداوار کے ساتھ مارکیٹنگ کو بہتر بنانا۔

اس پروجیکٹ کے تحت دنبے اور بھیڑ سے اون اتارنے کے لیے یو ایس ایڈ نے اون اتارنے والی مشینی قینچیاں متعارف کروائی ہیں۔ عام قینچی سے ایک دن میں 10 سے 12 دنبوں کا اون اتر پاتا ہے جب کہ ان مشینوں سے 50 دنبوں کا اون اتر جاتا ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت ایک مقامی کاروبار کے ذریعہ ضروری مشینری کو درآمد کیا جارہا

ہے۔ اس کے علاوہ قینچیوں کی دھار تیز کرنے کے لیے ایک مرکز بھی بنایا گیا ہے تا کہ قینچیوں اور کنگیوں کو درست حالت میں رکھا جاسکے۔ پروجیکٹ نے تربیت دینے کے لیے کچھ اون اتارنے والے استاد بھی فراہم کیے ہیں جو مزید ایسے کسانوں کو تربیت دینگے جو اون اتارنے والی گشتی گاڑی کو کاروبار کرنے کے غرض سے خریدنا چاہیں۔ پروجیکٹ نے ایک کاروباری ماڈل بنایا ہے تا کہ اس تکنیک کو اپنانے والوں کے لیے آسانی ہو۔ ان لوگوں کو دکھانے کے لیے ماڈل (پروٹو ٹائپ) تیار کروا کر حکومت کو بھی دیا گیا ہے تا کہ اس کاروباری طرز کو ملک بھر میں عام کیا جاسکے۔ یو ایس ایڈ نے اون سے جڑے کسانوں کو ملک کے مختلف حصوں میں تجارت کرنے والوں سے متعارف کرایا ہے۔ اس حوالے سے ایک کاروبار گیلیکسیز لوجسٹک انٹرنیشنل کا بیان ہے کہ وہ اس تکنیک اور آلہ جات سے حاصل کردہ اون کی بدولت اپنی برآمدی منڈی کو چائنا، بھارت اور مصر تک پھیلا سکتے ہیں۔16

- ڈیری پروجیکٹ17

اس پروجیکٹ کا مقصد پنجاب میں دودھ کے کاروبار کے لیے چھوٹے پیمانے پر مال مویشی پالنے والے (ڈیری فارمر) کسانوں خاص کر کے عورتوں کو تربیت فراہم کر کے دودھ کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ فروخت کرنے کے مزید منافع بخش طریقوں سے روشناس کرانا اور ان کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے۔

اس پروجیکٹ کے تحت میٹرک پاس دیہی عورتوں کو مویشیوں کی صحت کے حوالے سے انتظامات اور انٹر پرینیور شپ کی تربیت فراہم کی جارہی ہے۔

- انٹر پرینیورز (Enterpreneurs)

اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد چھوٹے کاروبار کرنے والے افراد (خصوصاً عورتوں) کی آمدنی میں اضافہ کرنا، ان کی بنائی ہوئی زرعی و غیر زرعی مصنوعات کی مارکیٹنگ کرنا ہے۔ اس منصوبے کے دیگر مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

- مجموعی طور پر 57,244 چھوٹے کاروباری افراد جن میں 21,961 دودھ کے کاروباری، 16,989 جڑی بوٹیاں اور پودے چننے والے، 15,797 ملبوسات سے مسلک افراد اور 2,497 شہد کی مکھیاں پالنے والوں کو تربیت دینا شامل ہے تا کہ وہ زیادہ منافع کما سکیں۔

- پاکستان فرمز پروجیکٹ18

اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد پاکستان کے حساس یا پسماندہ ترین علاقوں کے چھوٹے اور درمیانی درجے کے مخصوص کاروباری شعبہ جات مثلاً آم، آلو، آڑو، کھجور، پھل اور سبزیوں کا گودا بنانے، ماہی گیری، کپڑے کی بنائی، ملبوسات، سنگ مرمر اور سیاحت کو بین الاقوامی سطح پر مقابلے کے اہل بنانا ہے۔

فرمز پروجیکٹ زیادہ پیداوار کے لیے کاروباری افراد کو:

- مصنوعات کی برآمد میں مدد کرتا ہے۔
- کاروباری مہارت، اس کی توسیع، ٹیکنالوجی کے استعمال اور پیداوار میں اضافے کی تربیت دیتا ہے۔
- مصنوعات کی رجسٹریشن کے مرحلے کو مکمل کرتا ہے تا کہ بین الاقوامی منڈی تک رسائی ممکن ہو۔

کاروباری ماحول کو ترقی دینے کے لیے پروجیکٹ حکومت پاکستان کو منصوبہ سازی اور اخراجات کے لیے لائحہ عمل بنانے اور پالیسی میں اصلاحات لانے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ پروجیکٹ بین الاقوامی معیار کے مطابق کارکردگی (best practices) کی بنیاد پر قومی، صوبائی اور ضلعی سطح پر ضوابط اور طریقہ کار طے کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ایسے حکومتی اداروں کی جو نجی شعبہ میں بڑھوتری کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں میں اصلاحات اور ان کی صلاحیتوں کو بڑھایا جارہا ہے۔ ان اداروں میں بورڈ برائے سرمایہ کاری اور اسمال اینڈ میڈیم انٹر پرائز ڈیولپمنٹ اتھارٹی شامل ہیں۔

- تجارت پروجیکٹ19

اس پروجیکٹ کا مقصد پاکستانی کسٹم سے جڑے ہوئے طریقہ کار اور پاکستان کمرشل سروس میں بہتری لانا ہے تا کہ افغان سرحد پر برآمدات اور تجارت میں اضافہ کیا جاسکے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا یو ایس ایڈ نے تین پروجیکٹس دیگر امریکی ایجنسیوں کو منتقل کر دیے۔ جن میں امریکی ایجنسی برائے تجارت اور ترقی (USTDA) شامل ہے۔ اس ادارے کی ذمہ داری ہے کہ وہ توانائی، نقل و حمل اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے تعمیراتی کام میں مدد کرے۔ مزید یہ کہ امریکی برآمد کنندگان اور کمپنیوں سے پاکستانی گروہوں کے تعلقات پیدا کرے۔ USTDA (یو ایس ٹی ڈی اے) کے لیے کامیابی امریکی مصنوعات اور خدمات کی برآمد (میں اضافہ) اور پاکستان میں مثبت ترقیاتی اثرات ہیں۔

اب تک یو ایس ایڈ کی مدد سے معاشی بڑھوتری کے شعبے میں چلنے والے کچھ منصوبوں پر معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ اب کیری لوگر بل کے تحت فراہم کردہ امدادی رقم پر کچھ معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔ امداد سے چلنے والے شعبہ جات پر جانچ اور نگرانی کے حوالے سے رپورٹ ہر چار ماہ بعد شائع کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے امریکی حکومت کی طرف سے مالی سال 2010 سے 2013 تک کے دورانیے پر مشتمل نگرانی رپورٹ شائع کی گئی۔20 رپورٹ کے مطابق:

اس مدت میں 3,984 ملین ڈالرز پاکستان میں امداد کے لیے مختص کیے گئے

تھے اور اس امداد میں سے 3,571 ملین ڈالرز (89.6 فیصد) خرچ کیے گئے۔ جس میں سے 2,269.4 ملین ڈالرز یعنی 63.55 فیصد اکنامک سپورٹ فنڈ (ای ایس ایف) کے تحت دیے گئے ہیں۔ ای ایس ایف کی مد میں آنے والی رقم کو آٹھ امریکی اداروں کے سپرد کیا گیا جن میں سب سے زیادہ رقم یو ایس ایڈ (94 فیصد) نے خرچ کی۔

امریکی محکمہ برائے زراعت کی فارن ایگریکلچر سروس (FAS) کے مطابق:21

''اکنامک سپورٹ فنڈ (معاشی امداد کے لیے فنڈ) امریکی کانگریس نے ایسے علاقوں کے معاشی و سیاسی استحکام کے لیے قائم کیا ہے جہاں امریکہ کے تحفظ کے حوالے سے مخصوص مفادات ہیں۔ یہ امداد مختلف طرح کے معاشی حوالوں سے خرچ کی جاسکتی ہے مثلاً تعمیراتی اور ترقیاتی منصوبوں پر۔ اگرچہ یہ امداد فوجی اخراجات کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی پر اس امداد کی موجودگی سے امداد لینے والی حکومت اپنے ترقیاتی بجٹ سے پیسہ فوجی منصوبوں کے لیے فارغ (استعمال) کرپاتی ہے''۔

پاکستان میں 2010-2013 کے دورانیہ میں امریکی امداد کے شعبہ جات، مختص اور جاری کردہ رقوم اور تناسب مندرجہ ذیل جدول 1 میں دیکھا جاسکتا ہے۔ فراہم کردہ امریکی امداد سب سے زیادہ انسانی فلاح و بہبود (33 فیصد) اور اس کے بعد استحکام کے حوالے سے (27 فیصد) مختص کی گئی ہے۔

جدول 1

امریکی امداد کے لیے مختص اور جاری کردہ رقوم کے اعداد و شمار

شعبہ جات	امداد (a) (فیصد)	مختص (b) (امریکی ڈالرز ملینز)	جاری کردہ (b) (امریکی ڈالرز ملینز)
انسانی فلاح و بہبود	33	1304.0	1784.6
استحکام	27	1057.9	682.0
تعلیم	9	348.0	305.1
توانائی	8	335.8	225.3
صحت	8	309.1	236.4
معاشی بڑھوتری	8	339.5	170.7
باہمی تعلقات والے شعبہ جات (کراس کٹنگ)	3	289.4	166.6

بحوالہ:

(a) Quarterly Progress and Oversight Report on the Civilian Assistance Program in Pakistan, 2013, Figure 1, p.9, (b) Ibid, Appendix I, pp.73-75.

یو ایس ایڈ کے تحت چلائے جانے والے شعبوں کے لیے مختص کردہ اور جاری کردہ رقوم کی تفصیلات پیش کرتا ہے۔ یو ایس ایڈ کو سب سے کم رقم (33.2 ملین امریکی ڈالرز) انسانی فلاح و بہبود کے شعبے کے لیے مختص کی گئی لیکن دراصل سب سے زیادہ رقم (1,542.8 ملین امریکی ڈالرز) اسی شعبہ میں خرچ کی گئی یعنی مختص کی گئی رقم سے 4,646.9 فیصد زیادہ خرچ کی گئی۔ سب سے زیادہ رقوم (1,275.3 ملین امریکی ڈالرز) استحکام کے تحت چلنے والے منصوبوں کے لیے رکھی گئی لیکن خرچ کل 480.9 ملین امریکی ڈالرز کیے گئے۔ جو کہ مختص کردہ رقم کا کل 37.7 فیصد ہے۔

> کیری لوگر بل کے تحت زیادہ امداد اکنامک سپورٹ فنڈ کے تحت دی گئی۔ اگرچہ یہ امداد فوجی اخراجات کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی پر اس امداد کی موجودگی سے امداد لینے والی حکومت اپنے ترقیاتی بجٹ سے رقم فوجی منصوبوں کے لیے فارغ (استعمال) کرپاتی ہے۔

جدول 2

یو ایس ایڈ کے لیے مختص اور جاری کردہ رقوم کے اعداد و شمار

شعبہ جات	مختص رقم a (امریکی ڈالرز ملینز)	جاری کردہ رقم b (امریکی ڈالرز ملینز)	خرچ کردہ رقم (فیصد)
توانائی	291.5	225.3	77.3
معاشی بڑھوتری	335.6	142.6	42.5
استحکام	1275.3	480.9	37.7
تعلیم	332.6	242.9	73.0
صحت	263.0	236.4	89.9
باہمی تعلقات	299.6	127.3	42.5
انسانی فلاح و بہبود	33.2	1542.8	4646.9
کل رقم	2803.8	2998.2	106.96

بحوالہ:

(a) Quarterly Progress and Oversight Report on the Civilian Assistance Program in Pakistan, 2013, Tables 3-11, (b) Ibid, Appendix I, pp 73-75.

امریکی کمرشل سروس

اب تک جو معلومات فراہم کی گئیں وہ یو ایس ایڈ کے تحت چلنے والے منصوبوں کے حوالے سے تھیں لیکن پاکستان میں موجود امریکی اداروں کے حوالے سے ایک اور ادارے امریکی کمرشل سروس ہے۔ یو ایس ایڈ کی فراہم کردہ امداد کو امریکی کمرشل سروس کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہے۔

امریکی کمرشل سروس امریکی محکمہ تجارت کے تحت انٹرنیشنل ٹریڈ ایڈمنسٹریشن کے لیے تجارت کو فروغ دینے کے لیے خدمات فراہم کرتا ہے۔ اس محکمہ سے جڑے ہوئے مخصوص تکنیکی مہارت رکھنے والے افراد (پروفیشنلز) سو سے زائد امریکی شہروں اور 75 دیگر ممالک میں موجود ہیں جو امریکی کمپنیوں کو نئی عالمی منڈیوں میں مصنوعات برآمد کرنے یا ان کی فروخت کے لیے مدد فراہم کرتے ہیں۔22 امریکی حکومت یہ مشورہ دیتی ہے کہ برآمد کرنے والی کمپنیاں امریکی آزاد تجارت کے معاہدوں کو پڑھیں۔ امریکی برآمد کی ویب سائٹ پر دی گئی معلومات میں بتایا گیا ہے کہ:

''امریکہ کے لیے تجارتی معاہدوں کا سب سے اہم مقصد امریکی برآمدات کے لیے تجارتی رکاوٹوں کو کم کرنا، غیر ممالک میں (تجارتی مقابلہ کے حوالے سے) امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرنا اور تجارت میں شریک ملک یا ممالک میں قانون نافذ (rule of law) کرنا یا قانون کا دائرہ کار بڑھانا ہے۔ تجارتی رکاوٹوں کو کم کرکے تجارت اور سرمایہ کاری کے لیے ماحول کے حوالے سے ایک مستحکم اور شفاف نظام کی موجودگی، امریکی کمپنیوں کے لیے ان کی مصنوعات اور خدمات کی برآمدات کم خرچ میں با آسانی مشترکہ منڈیوں میں فراہم کرتی ہے''۔23

پاکستان میں امریکی کمرشل سروس

اسلام آباد میں موجود امریکی سفارت خانے میں پاکستان کے لیے امریکی کمرشل سروس قائم ہے۔ اس سروس کا کہنا ہے کہ:

''ہم اپنے دفاتر کے ذریعہ، جو اسلام آباد کے سفارت خانے اور ہمارے لاہور اور کراچی قونصلیٹ میں موجود ہیں، توجہ مرکوز رکھتے ہیں کہ امریکی اشیاء مصنوعات، آلہ جات، خدمات اور ٹیکنالوجی کی برآمدات کو امریکہ سے پاکستان فروغ دے سکیں خاص کرکے جب یہ برآمدات چھوٹے اور درمیانے درجہ کے کاروبار کررہے ہوں اور پاکستان میں امریکی کاروبار کے مفادات کی حفاظت پر بھی توجہ مرکوز رکھتے ہیں''۔24

اس سروس کا کہنا ہے کہ پاکستان دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے اور اگر امریکی کمپنیاں یہاں پر کاروبار کرنا چاہیں تو امریکی کمرشل سروس برآمدات بڑھانے کے لیے اپنے وسائل پیش کرسکتی ہے۔ یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف کامرس نیٹ ورک کے تین دفاتر پاکستان میں اور 100 سے زائد دفاتر امریکہ میں موجود ہیں۔ یو ایس کمرشل سروس اور یو ایس ڈیپارٹمنٹ آف اسٹیٹ 2014 کے ایک شائع کردہ تحریر

"Doing Business in Pakistan: 2014 Country Commercial Guide for U. S. Companies" (پاکستان میں کاروبار کے لیے: امریکی کمپنیوں کے لیے قومی کاروباری رہنماء کتابچہ 2014) میں امریکی کمپنیوں کے لیے پاکستان میں کاروبار کرنے کے لیے تحقیق اور معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ اس رہنماء کتابچے کے کچھ اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:25

- امریکہ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے جبکہ امریکہ کے لیے

امریکی کمرشل سروس کے مطابق:

- امریکہ پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔ جبکہ امریکہ کے لیے پاکستان ایک معمولی شراکت دار ہے۔
- کیری لوگر بل کے تحت پاکستان میں انفرااسٹرکچر کے حوالے سے ترقیاتی منصوبے چلائے جائیں گے جو امریکی کاروباری کمپنیوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔
- امریکی زرعی اور زراعت سے جڑی ہوئی مصنوعات کی پاکستان برآمدات میں پچھلے پانچ سالوں میں 24.6 فیصد اضافہ ہوا۔
- ذہنی ملکیت کے تحفظ کے قوانین کی غیر موجودگی امریکی جینیاتی بیج کی فروخت میں رکاوٹ ہے۔

پاکستان ایک معمولی شراکت دار ہے۔

- 2013 میں امریکہ نے پاکستان کو 1.63 بلین ڈالرز کی مصنوعات و خدمات برآمد کیں جو پچھلے سال 2012 میں 1.53 بلین ڈالرز کی برآمدات کے مقابلے سات فیصد زیادہ ہے۔ اس کے برعکس پاکستان نے 3.68 بلین ڈالرز کی درآمدات امریکہ بھیجیں جو پچھلے سال کے مقابلے صرف 1.6 فیصد اضافہ ہے۔

- امریکی کمرشل سروس کا کہنا ہے کہ 2009 میں انتظامیہ نے کیری لوگر برمن بل کے تحت پاکستان کو پانچ سالوں میں 7.5 بلین ڈالرز کی امداد فراہم کرے گا۔ اس امداد کے تحت پاکستان میں انفرااسٹرکچر کے حوالے سے ترقیاتی منصوبے چلائے جائیں گے جو امریکی کاروباری کمپنیوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

- رپورٹ کے تحت یہ بھی کہا جارہا ہے کہ پاکستان نے انٹرنیشنل مونیٹری فنڈ (IMF) کے ساتھ بھی تین سالوں پر محیط معاہدہ کیا ہے جس کے تحت پاکستان کو 6.7 بلین ڈالرز (قرض) ملے گا اور اس کی بنیاد پر بھی پاکستان کو کئی طرح کے معاشی و ماحولیاتی اصلاحی منصوبے نافذ کرنے پڑیں گے۔

- امریکہ کے مطابق پاکستان کی کئی ایسی صفات ہیں جن کی وجہ سے وہ بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے ایک پرکشش منڈی ہے، خاص کر روزمرہ استعمال کی اشیاء (consumergoods) کا شعبہ۔

- امریکی کمپنیوں کی پاکستان میں ایک مضبوط ساکھ ہے۔ اس وقت 65 سے زائد امریکی کمپنیاں لاہور میں قائم امریکی بزنس فورم اور امریکی بزنس کونسل میں رجسٹرڈ ہیں۔ ان دونوں فورم کے کارپوریٹ ممبران پاکستانی معیشت میں ایک اہم اور موثر کردار رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ کارپوریٹ گورننس (کاروباری انتظام) کے حوالے سے عالمی معیار پیش کرتے ہیں۔

- زراعت امریکہ کے لیے ایک اہم شعبہ ہے۔ امریکی زرعی اور زراعت سے جڑی مصنوعات کی پاکستان برآمدات میں پچھلے پانچ سالوں میں 24.6 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ 12-2011 سے 13-2012 کے دوران زرعی برآمدات میں 10 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ 13-2012 میں امریکی برآمدات 360.7 ملین ڈالرز تھیں۔ جبکہ اسی مدت میں پاکستان سے امریکہ کو زرعی برآمدات 120.8 ملین ڈالرز کی تھیں۔

- امریکہ کے لیے زرعی شعبے میں سب سے اہم مصنوعات میں پیما (pima) کپاس، دودھ دینے والے جانور (dairy cattle) ، جانوروں کے جین (animalgenetics)، لکڑی کی مصنوعات، دالیں، خشک میوہ، تیار کھانے اور بوائی کے لیے بیج شامل ہیں۔

- پاکستان میں ذہنی ملکیت کے معاہدوں کے لیے ضوابط کی غیر موجودگی نے امریکی بائیوٹیک (جینیاتی) بیج کی فروخت میں رکاوٹ ڈالی ہے اس کے علاوہ زندہ جانوروں کی درآمد پر پابندی نے امریکہ کو بڑھتے ہوئے ڈیری (دودھ) کے شعبہ میں حصہ لینے سے روکا ہوا ہے۔

- پاکستان میں سیاسی استحکام میں کمی کی وجہ سے امریکی برآمد کنندگان پاکستان میں کارآمد منڈیوں اور کاروبار کو بڑھانے کے لیے نہیں آپارہے ہیں لیکن اسلام آباد میں امریکی دفتر برائے زرعی امور (Office of Agricultural Affairs) کا خیال ہے کہ جیسے جیسے امریکی فوجی افغانستان سے واپس جائیں گے اور امریکہ پاکستان تعلقات میں مضبوطی آئے گی، امریکی زرعی برآمدات کے لیے مواقع بڑھیں گے۔ اس حوالے سے اس دفتر نے پاکستانی تیار کھانے بنانے والے، کسانوں اور دودھ سے جڑے کسان اور زرعی صنعت کے نمائندوں کو امریکی محکمہ برائے زراعت کی پیش کردہ خدمات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

تجزیہ

امریکی امداد پائیدار ترقی کے لیے

پاکستان کو 2010-2013 کے دوران دی جانی والی امریکی امداد کے بارے میں پچھلے صفحات میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان تفصیلات سے کچھ اہم نکات سامنے آئے ہیں۔

عالمی سطح پر بین الاقوامی امداد پر پالیسی سازی میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ امداد کا مقصد پائیدار ترقی کا حصول ہے اور وہ اسی وقت ممکن ہے جب عام مزدور و کسان کی آواز کو بھی فیصلہ سازی میں شامل کیا جائے۔ حکومت پاکستان کا پالیسی سازی میں جھکاؤ نیولبرل ازم کی طرف بالکل واضح ہے۔ نیولبرل ازم کے اصولوں میں نجکاری، ڈی ریگیولیشن اور آزاد تجارت اہم ترین اصول ہیں۔ پاکستان کے لیے جتنی بھی پالیسیاں بنائی جارہی ہیں میں نیولبرل ازم کے تمام اصول رائج کرنے کا انتظام ہے۔ اس عمل میں پاکستانی عوام کو کب شامل کیا گیا؟ یہ تو واضح ہے کہ کس طرح نجی شعبے کے لیے منافع کے حصول پر مبنی پالیسی سازی کی جارہی ہے۔ اگر پاکستان کا نجی شعبہ اس پالیسی سازی میں شامل تھا تو کیا یہ پاکستانی عوام کو معلوم ہے؟ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوا

ہے، یا عوامی گروہوں کو فیصلہ سازی میں نہیں بٹھایا گیا ہے تو پھر امریکی امداد کس طرح سے نیولبرل ازم کو اپنانے کے لیے تمام منصوبے نافذ کررہی ہے؟

دراصل امریکی امداد پاکستان کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ امریکی سیاسی و معاشی مفاد کے لیے فراہم کی جارہی ہے۔ اگر پاکستان میں مخصوص کاروباری گروہوں کو نظر میں رکھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ امداد یقیناً پاکستانی بڑے کاروباری گروہوں کے لیے فائدہ مند ہے جو بین الاقوامی منڈی میں تجارت کرنے کے قابل ہیں۔ اس اہم نکتے کی نشاندہی خود امریکی دستاویز کرتی ہے کہ ''پاکستان میں زرعی پالیسی نہیں ہے اور زراعت کے حوالے سے جو لائحہ عمل اپنایا جاتا ہے اس کی سیاسی وجوہات ہوتی ہیں جن میں پائیدار بڑھوتری کا حصول مقصد نہیں۔ زیادہ تر پاکستانی سیاستدان اور پالیسی ساز / قانون ساز دیہی علاقوں سے ہیں جو دیگر طاقتور صنعتی گروہوں کے ساتھ زرعی پالیسی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ مفاد پرست گروہ (Interest Groups) کسانوں اور صارفین کی ضروریات کے بجائے اپنے مخصوص مفادات کو فوقیت دیتے ہیں''۔26

اگر یہ نکتہ پاکستانی سیاستدانوں اور حکومت کے لیے صحیح ہے تو یقیناً امریکی حکومت کی امداد کے حوالے سے بھی بالکل صحیح ہے۔ نا حکومت پاکستان اور نا ہی امریکی حکومت پاکستانی عوام کی بہتری اور خوشحالی کے لیے کام کررہے ہیں۔

امریکی امداد کے پیچھے معاشی مفادات

امریکی کمرشل سروس کے رہنماء کتابچے سے یہ حقیقت واضح ہے کہ امریکہ جو دنیا کا سب سے طاقتور سرمایہ دار ملک ہے، کے لیے سب سے زیادہ اہم مقصد سرمایہ دارانہ نظام کا فروغ ہے تاکہ اس کی بین الاقوامی کمپنیوں کی عالمی منڈیوں تک رسائی اور ان پر غلبہ ممکن ہوسکے۔ یقیناً یہ کوئی ڈھکا چھپا مفاد نہیں کیونکہ پچھلی کئی دہائیوں سے دیگر امریکی حکومتوں نے آزاد تجارت اور نیو لیبرل ازم کی پالیسیوں کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیا ہے۔ آئی ایم ایف (IMF)، ورلڈ بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک جو خود سرمایہ دارانہ نظام کے خاص آلہ کار ہیں بھی نیولبرل ازم کی پالیسیوں کو دنیا بھر میں پھیلا رہے ہیں۔ اس حقیقت کی نشاندہی بھی امریکی محکمہ تجارت نے کی ہے کہ 2009 میں آئی ایم ایف کی طرف سے فراہم کردہ قرض پاکستان میں آزاد تجارت کے فروغ کے لیے کئی اصلاحات نافذ کروائے گا۔

اس کے علاوہ ڈبلیو ٹی او بنانے میں اور اس ادارے کے تحت نہایت عوام دشمن معاہدوں کے نفاذ میں امریکی حکومت کا بہت بڑا کردار رہا ہے، خاص کر عالمی زرعی معاہدے (اے او اے) اور ذہنی ملکیت کے معاہدے (ٹرپس) کے حوالے سے۔27

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ کیری لوگر بل کے تحت پاکستان اسٹریٹجی سپورٹ پروگرام نے کئی پالیسی دستاویز شائع کی ہیں۔ ان سے واضح ہے کہ آزاد تجارت کی پالیسیوں کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی گئی ہے۔ خاص کر کے ذہنی ملکیت کے تحفظ کے حوالے سے افپری کی بیج کی صنعت پر رپورٹ ایک طرف سرکاری پاکستانی بیج کے اداروں کو بند کرنے اور دوسری طرف نجی پلانٹ بریڈرز کے ذہنی ملکیتی حقوق کے تحفظ کے لیے قانون سازی کی وکالت کررہی ہے۔ مجوزہ پنجاب سیڈ ایکٹ کی طرفداری کرتے ہوئے بیج کے لیے نجی شعبے کی قیادت میں ایک خودمختار طریقہ کار قائم کرنے والے ادارے کی پیروکاری کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ امریکی کمرشل سروس بھی یہ نکتہ اٹھارہا ہے کہ ذہنی ملکیتی حقوق کی غیر موجودگی میں امریکی کمپنیاں بیج اور مال مویشی کے شعبے میں پاکستانی منڈی میں داخلے سے گریز کررہی ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس سال پاکستانی حکومت کی بیج اور پلانٹ بریڈرز رائٹس کے لیے قانون سازی پر پیش رفت امریکی حکومت کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ یورپی یونین جس میں دنیا کے سب سے زیادہ سائنسی ترقی کے حامل ممالک شامل ہیں نے امریکی جینیاتی بیجوں کو اپنے ممالک میں اگائے جانے کے لیے کئی شرائط یا پابندیاں عائد کردی ہیں۔28 اگر جرمنی اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ممالک جینیاتی بیجوں پر پابندی لگارہے ہیں تو پاکستان کی حکومت کیوں اپنے ملک میں ایسے قوانین نافذ کررہی ہے جو امریکی بین الاقوامی کمپنیوں کے مفاد میں ہیں؟

امریکہ جینیاتی سائنس کے حوالے سے کئی نئی ٹیکنالوجیوں پر کام کررہا ہے جنہیں جینیاتی فصلوں اور جانوروں کی پیداوار کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ مثلاً یو ایس ایڈ نے ایک امریکی یونیورسٹی، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ڈیوس کو ایک نئے منصوبے کے لیے چھ ملین ڈالرز کی گرانٹ فراہم کی ہے۔29 اس نئے پروجیکٹ کا نام ''فیڈ دی فیوچر انوویشن لیب فار جینومکس ٹو امپروو پولٹری'' (Feed the Future Innovation Lab for Genomics to Improve Poultry) ہے۔ اس منصوبے کا مقصد ایسے جینیاتی مواد کی نشاندہی ہے جن کے ذریعہ گرم موسم کو برداشت کرنے والی مرغیوں کی افزائش نسل کی جائے۔ یہ مرغیاں لگنے والی بیماریوں کا بھی مقابلہ کر پائیں گی۔ امریکی حکومت کا کہنا ہے کہ فیڈ دی فیوچر (Feed the Future) عالمی بھوک اور غذائی تحفظ جیسے مسائل کے حل کے لیے ایک نیا منصوبہ ہے جس کے تحت یہ دیگر شریک ممالک میں ان کے زرعی شعبہ کو بڑھانے میں مدد دے گا تاکہ معاشی بڑھوتری اور تجارت کے فروغ کے ذریعے آمدنی بڑھ سکے اور بھوک، غربت اور غذائیت جیسے مسائل کم کیے جاسکیں۔30 اس منصوبے کے تحت نجی شعبے کو حقیقی طور پر شامل کرنے پر زور دیا گیا ہے تاکہ ترقی کے بنیادی نکات اور اہم کاروباری مفاد دونوں کو فائدہ پہنچے۔

پاکستان نے حال میں ہی امریکی حکومت کے دباؤ پر زندہ جانوروں کی امریکہ سے درآمد پر پابندی ہٹا دی ہے۔ گوکہ پاکستان دنیا کے مال مویشی رکھنے والے ممالک میں تیسرا بڑا ملک ہے۔ پاکستان آسٹریلیا سے بھی گائے درآمد کررہا ہے اور امریکی حکومت کی کوشش ہے کہ ان کے ملک سے بھی پاکستان گائے درآمد کرنا شروع

کردے۔ غیر ملکی گائے کو فروغ دینے کا مقصد دودھ کی پیداوار میں اضافہ کرنا ہے۔ آسٹریلوی گائے دیسی گائے سے تین گنا زیادہ دودھ دیتی ہے لیکن آسٹریلوی گائے پاکستانی گائے سے ایک سے تین لاکھ زیادہ مہنگی ہے، عام چارہ نہیں کھاتی، پانی زیادہ پیتی ہے اور گرمی برداشت کرنے کی کم صلاحیت رکھتی ہے۔ ان حالات میں دوسرے ممالک سے جانور درآمد کرنے کی کیا ضرورت ہے جس سے پاکستانی زرمبادلہ پر شدید دباؤ پڑتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ پاکستان میں دودھ کی پیداوار دیگر پڑوسی ممالک سے کہیں زیادہ ہے۔[31] اس کے باوجود پاکستان کی کثیر آبادی غذائی کمی کا شکار ہے۔ یقیناً اب اور زیادہ دودھ کی پیداوار عوام میں غذائی کمی پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ منافع بخش کاروبار کو بڑھانے کے لیے کی جارہی ہے۔ غیر ملکی مہنگی گائے غریب کسان کی دسترس سے باہر ہے۔ یہ گائے صرف زرعی کاروبار کرنے والے گروہ ہی خرید سکتے ہیں۔

اب جانوروں کے لیے خاص چارہ بھی ایک منافع بخش شئے کے طور پر منڈی میں غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعے فروخت کیا جارہا ہے۔ میگزم انٹرنیشنل (Maxim International) نامی کمپنی جس نے 2009 میں پاکستان میں جانور کو موٹا کرنے والا اعلیٰ معیار کا چارہ (feed) فروخت کرنا شروع کیا، اپنی ویب سائٹ پر یہ اعلان کرتی ہے کہ اکتوبر 2013 سے وہ ایک امریکی کمپنی ورلڈ وائیڈ سائرز لمیٹڈ (World Wide Sires) کی پاکستان میں نمائندگی کرے گی۔ ورلڈ وائیڈ سائرز عالمی سطح پر مال مویشی کے لیے جینیاتی مارکیٹنگ کرنے والا نامور ادارہ ہے جو امریکی آرٹیفیشل انسیمنیشن کوآپریٹوز (US Artificial Insemination Cooperatives) کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ ورلڈ وائڈ سائرز دودھ دینے والی گائے کی افزائش نسل کے لیے نر حیوانوں کا مادہ منویہ (semen) فراہم کرتا ہے۔[32] اس کمپنی کے پاس کئی طرح کی نسلوں کی پیداوار کے لیے مواد موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکی جینیاتی ٹیکنالوجی مقامی مال مویشی کی نسلوں میں بگاڑ پیدا کرکے مقامی کسانوں کو محتاجی کی طرف دھکیلے گی۔ مزید دودھ کی پیداوار کے لیے امیر ممالک سے درآمد کردہ جانور، جینیاتی، دیگر ٹیکنالوجی اور سائنسی مہارت لے کر مزید قرضے میں دب کر عوام کو بدحال کرنے کے لیے اقدامات کیوں کیے جارہے ہیں؟ کیا یہ پائیدار زراعت اور پائیدار ترقی کی طرف قدم ہے؟

مالی سال 14-2013 میں پاکستان نے اعلیٰ معیار کے مادہ منویہ کی 389.7 ہزار خوراک (doses) اور 7,186 دودھ دینے والی گائے درآمد کیں۔ اس کے علاوہ مال مویشیوں کے لیے چارہ (cattle feed) اور دیگر مشینری بغیر محصولات کے ملک میں درآمد کرنے کی اجازت دی گئی۔[33] کیا پاکستان اتنا زیادہ امیر ملک ہے کہ وہ محصولات کے ذریعے اپنی آمدنی کو چھوڑ دے؟ اگر ایسا ہے تو پھر امریکہ سے امداد اور آئی ایم ایف سے سود سمیت قرضہ کیوں لیا جاتا ہے؟ اور مقامی کسانوں سے زرتلافی کیوں واپس لی جارہی ہے؟

پاکستان ایک دیہی ملک ہے اس لیے وہ پانچ شعبہ جات جن پر کیری لوگر بل کے تحت خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے میں معاشی بڑھوتری کا شعبہ خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس شعبے کے تحت یو ایس ایڈ نے زیادہ توجہ زراعت پر دی ہے۔ اس مد میں یو ایس ایڈ اور باقی تمام امریکی ایجنسیوں نے سال 2010 تا 2013 کل 170.7 ملین ڈالرز (یعنی تقریباً 170 بلین روپے) خرچ کیے جو کل امداد کی خرچ کردہ رقم کا 4.8 فیصد اور معاشی بڑھوتری کے شعبے پر مختص کردہ رقم کا 50 فیصد ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ امریکی امداد کا بہت تھوڑا حصہ زراعت میں معاشی ترقی کے لیے مختص کیا گیا اور خرچ اس سے بھی کم کیا گیا۔ پاکستانی عوام کے لیے نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اتنی قلیل امداد سے بھی کتنے اہم اور کلیدی کام پاکستانی حکومت سے کروائے گئے ہیں جو بڑے پیمانے پر امریکی برآمدات بڑھانے میں مدد دیں گے۔

پاکستان کے مزدور و کسان شدید استحصالی نظام میں پھنس کر بھوک، غربت اور ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان حالات میں زراعت میں سب سے اہم پالیسی منصفانہ اور مساویانہ زمین کی تقسیم ہونی چاہئے۔ امریکی محکمہ برائے زراعت نے اعتراف کیا ہے کہ ''دنیا میں تقریباً ایک بلین لوگ بھوک کا شکار ہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس یا تو اگانے کے لیے ناکافی زمین ہے یا پھر ان کے پاس غذا خریدنے کے لیے ناکافی آمدنی ہے''۔[34] کیری لوگر بل کے تحت چلنے والے منصوبوں میں سے کسی ایک نے بھی اس اہم ترین مسئلہ کو حل نہیں کیا۔ نا تو کوئی پالیسی دستاویز تیار کیا گیا جو پاکستان میں بڑے پیمانے پر بے زمین کسانوں کے معاشی و سماجی مسائل کی کم از کم نشان دہی کرتا اور نا ہی اس شدید معاشی و سماجی ظلم و استحصال کو ختم کرنے کے لیے کوئی عملی منصوبہ بنایا گیا۔

زراعت میں معاشی بڑھوتری کے حوالے سے جتنے بھی منصوبے چلائے گئے ان میں سے زیادہ تر کا مقصد منڈی تک رسائی اور ایک مخصوص طبقہ کی آمدنی میں اضافہ تھا۔ اگر بیان کردہ زیادہ پیداوار اور منڈی تک رسائی کے حوالے سے منصوبوں پر غور کریں تو سمجھ آتا ہے کہ زیادہ پیداوار تو وہی کسان حاصل کرسکتا ہے جس کے پاس کافی زمین ہے۔ یعنی بے زمین کسان اس پروگرام کا حصہ ہی نہیں جو سب سے زیادہ ضرورت مند اور پسا ہوا طبقہ ہے۔ یہ کوئی نہایت پیچیدہ تکنیکی مسئلہ نہیں ہے کہ برآمدی منڈیوں تک رسائی صرف وہ کسان حاصل کرسکتے ہیں جن کے پاس کافی بڑے پیمانے پر نا صرف سرمایہ ہو بلکہ اتنی تعلیم بھی ہو کہ وہ رجسٹریشن، درآمدی سندیں اور برآمدات کے لیے دیگر لوازمات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ پاکستان کے چھوٹے کسان تو وسائل کی کمی کی وجہ سے اپنے گاؤں سے بڑے شہروں کی منڈی تک بھی نہیں پہنچ پاتے۔ غیر ملک کیسے جائیں گے؟

اسی طرح اون اتارنے والی مشینی قینچیوں پر بھی اگر غور کیا جائے تو یہ آلہ جات انہی مال مویشی رکھنے والوں کے لیے فائدہ مند ہیں جن کے پاس بڑے ریوڑ ہوں۔ چھوٹے کسان تو زیادہ سے زیادہ 12-10 دنبے رکھ پاتے ہیں خاص کر ریگستانی علاقوں میں اور ایسے علاقوں میں جہاں خشک سالی ہے۔ پھر یقیناً اون کا کاروبار وہی گروہ کریں گے جن کے پاس کافی وسائل ہیں۔

ہاں یہ ضرور ہوگا کہ پاکستان میں بہتر مہارت رکھنے والے مزدوروں کی تعداد بڑھ جائے گی جو بہتر معیار کا کام تو ضرور کر پائیں گے لیکن اس کے بدلے ان کی اجرت میں ضروری نہیں کہ بہت بڑی تبدیلی آئے گی۔ پاکستان کثیر آبادی والے ممالک میں شمار کیا جاتا ہے اور اس طرح مزدوروں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے ان کی اجرت کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔ سرمایہ دار ایسی منڈیوں کی طرف راغب ہیں جہاں سستے لیکن بہتر ہنر رکھنے والے مزدور دستیاب ہوں۔ امریکی امداد بھی سپلائی چین اور ویلیو چین کی بہتر کارکردگی کا پرچار کرتی نظر آتی ہے۔ دراصل یہ ان نہایت سستے کسان مزدوروں کی ''اسمبلی لائن'' بنوائی جارہی ہے جو تیز اور اعلیٰ معیار کی زیادہ پیداوار فراہم کر سکے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہاں پر عورتوں کی بہتر آمدنی تک رسائی جس کا یو ایس ایڈ کے کئی منصوبوں میں ذکر آیا اس پر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔ یو ایس ایڈ کے تحت دیہی ترقیاتی پروجیکٹ میں خواتین ایکسٹینشن ورکز کے تربیتی پروگرام جنوبی پنجاب میں چلائے گئے ہیں۔ اس تربیتی پروگرام میں شامل ضلع وہاڑی کی ایک عورت کا کہنا ہے کہ اس پروجیکٹ میں کئی گاؤں شامل تھے اور ہر گاؤں سے کم از کم دو میٹرک پاس خواتین کو لیا گیا تھا۔ انہیں مختلف حوالے سے تربیت دی گئی جس میں مصنوعی سیمن یعنی نر حیوانوں کا مادہ منویہ ڈالنے کا طریقہ، جانوروں کی طبی امداد، گوشت اور دودھ کی پیداوار بڑھانے اور دودھ ٹھنڈا رکھنے کے طریقے سکھائے گئے۔ تربیتی پروگرام ختم ہونے پر 70,000 روپے کا سامان جس میں 30,000 روپے کا جانوروں کا مخصوص چارہ (ونڈا) اور 30,000 روپے کی ادویات دی گئیں کہ وہ ایک کلینک کھولیں اور اپنا کاروبار چلائیں۔ دیے گئے مخصوص برانڈ کے چارے اور ادویات فروخت ہونے پر انہی ادویات اور چارے کو مزید خرید کر کاروبار چلائیں۔ دودھ کی کمپنی نیسلے کی مصنوعات کے ''اعلیٰ معیار'' پر کافی معلومات دی جاتی تھیں اور تلقین کی جاتی تھی کہ نیسلے مصنوعات کی تشہیر کریں۔

اس منصوبے کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عورتوں کو کافی فائدہ مند ہنر سکھائے گئے ہیں لیکن اس کی آڑ میں کمپنیوں خصوصاً امریکی کمپنیوں مثلاً ورلڈ وائڈ سائرز کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے دیہی سیلز گرلز (سامان بیچنے والی عورتیں) کی ملک بھر میں ٹیم بنائی گئی ہے۔ جو کام شہروں میں ''روزگار'' کے نام پر کروایا جارہا ہے اور جس سے روزی مشکل سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ تنخواہ کم ہوتی ہے اور زیادہ آمدنی کمیشن کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے، وہی کام اب دیہی علاقوں میں پھیلایا جارہا ہے۔ یہ لکھنا نہایت ضروری ہے کہ اس کام سے پاکستان کا پیداواری شعبہ نہیں بڑھے گا بلکہ صرف خدمات (Services) کی صنعت میں وسعت آئے گی جو بہر حال معاشی استحکام کی طرف پیش قدمی نہیں ہے بلکہ بیرونی کمپنیوں کی محتاجی پر مبنی غیر رسمی روزگار ہے۔

اگر حساب کتاب کریں تو سمجھ آتا ہے کہ امریکہ پانچ سال میں 7.5 بلین ڈالرز امداد فراہم کرنے والا تھا۔ دوسری طرف سالانہ 1.5 بلین ڈالرز کی برآمدات کرنے میں کامیاب ہوا ہے یعنی جتنی امداد فراہم کی گئی وہ اس دوران ساری وصول ہوگئی ہے۔ امداد کی مد میں دی گئی رقم سے آزاد تجارت کو فروغ دینے کے لیے جارحانہ منصوبے نافذ کیے جارہے ہیں۔ جس سے عین ممکن ہے کہ امریکی برآمدات ڈیڑھ فیصد سے کئی گنا بڑھ جائیں گی۔ خیال رہے کہ پاکستان ابھی بھی امریکہ سے تجارت کرنے پر خسارہ اٹھا رہا ہے اگر امریکی برآمدات بڑھ گئیں تو خسارہ بھی یقیناً مزید بڑھے گا۔ اس حوالے سے پچھلے سالوں میں پاکستان سے امریکہ آم کی برآمد پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی آم کو امریکی منڈی تک پہنچنے میں کئی مسائل درپیش ہیں۔ امریکی ماحولیاتی حفاظتی اقدام کے حوالے سے پاکستانی آم کو کئی طرح کے حفاظتی اقدام پورے کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی آم کو اریڈیشن پلانٹ سے گزارنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے حکومت پاکستان کو اریڈیشن پلانٹ جس کی قیمت تقریباً دو ملین امریکی ڈالرز ہے درآمد کرنا پڑا ہے۔35 اگر آم کی برآمد سے منافع ہوا بھی ہے تو وہ نجی شعبے سے جڑے برآمدکنندگان کو ہوا ہوگا جبکہ پاکستانی حکومت کو مزید مہنگا سودا کرنا پڑا جس سے حکومتی خزانے پر دباؤ اور عوام کے لیے خرچ کی جانے والی رقم میں مزید کمی لازم ہے۔ اس کے علاوہ اس طرح اعلیٰ معیار کا آم تو ملک سے باہر چلا جاتا ہے اور پاکستانی عوام صدیوں سے حاصل اہم غذائی پھل سے محروم ہوتی جارہی ہے۔ کئی دیگر ممالک مثلاً سنگاپور، ہانگ کانگ اور کوریا جیسے ممالک کو آم برآمد کرنے کے لیے کئی طرح کے حفاظتی اقدامات بھی پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً آم کو باغ میں ہی ایک خاص قسم کا لفافہ پہنا دیا جاتا ہے تاکہ وہ کیڑوں کے حملے سے محفوظ رہ سکے۔ یہ حفاظتی لفافے خاص طور پر آسٹریلیا اور کوریا سے درآمد کیے جاتے ہیں۔

> کیری لوگر بل کے تحت ملنے والی ایک بڑی رقم پاکستانی عوام پر خرچ ہی نہیں ہوئی بلکہ پاکستان کی آڑ میں یہ امداد افغان مہاجرین کو دے دی گئی۔

> پاکستانی برآمدات بڑھانے کے لیے غیر ملکی امداد جو بھی طریقے متعارف کراتی ہے اس کے ذریعے اپنے ممالک سے برآمدات کے لیے کئی راستے کھول لیتی ہے۔

یہ لکھنا غلط نہیں ہوگا کہ پاکستانی برآمدات بڑھانے کے لیے غیر ملکی امداد جو بھی طریقے متعارف کراتی ہے۔ اس کے ذریعے اپنے ممالک سے برآمدات کے لیے کئی راستے کھول لیتی ہے۔ آخر یہ ترقی کس کی ہوگی؟

امریکی امداد کے سیاسی مفادات:

کیری لوگر بل کے تحت پانچ شعبہ جات میں انسانی فلاح و بہبود نہیں تھا لیکن اس گرانٹ کے تحت اس شعبے پر سب سے زیادہ رقم خرچ کی گئی ہے۔ یو ایس ایڈ کے

مطابق اس شعبہ کے لیے یو ایس ایڈ کو کل 33 ملین امریکی ڈالرز مختص کیے گئے تھے لیکن جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ خرچ کردہ رقم 1,543 ملین ڈالرز یعنی 4,000 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔ ایک اور اہم نکتہ ہے کہ 2010-2013 کے دوران جو امدادی رقم مختص کی گئی تھی وہ سوائے انسانی فلاح و بہبود کے باقی ہر شعبے میں کم دی گئی۔ اس مخصوص شعبے میں 1,304 ملین ڈالرز مختص کیے گئے اور ساری امریکی ایجنسیوں نے ملا کر 1,784.6 ملین ڈالرز خرچ کیے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس مد میں تمام رقم کوئٹہ اور خیبر پختون خواہ کے علاقوں میں افغان مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کی گئی۔ یعنی کیری لوگر بل کے تحت آئی ہوئی ایک بڑی رقم پاکستانی عوام پر خرچ ہی نہیں ہوئی بلکہ پاکستان کی آڑ میں امداد افغان مہاجرین کو دے دی گئی۔ اگر استحکام اور انسانی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو جاری کردہ امداد جمع کرلی جائے تو 2010 سے مارچ 2013 تک 69 فیصد جاری کردہ امداد صرف افغانستان اور پاکستان کے درمیان سیاسی تعلقات پر مبنی حالات سے نمٹنے کے لیے خرچ کیے گئے ہیں۔

یو ایس ایڈ کا دوسرا بڑا حصہ یعنی 27 فیصد ملک میں استحکام لانے کے لیے خرچ کیا۔ جیسا کہ امریکی محکمہ خود کہتا ہے کہ استحکام کے حوالے سے بھی توجہ زیادہ تر خیبر پختون خواہ اور فاٹا کے علاقوں پر مرکوز ہے۔[36]

پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے جن مخصوص پروگراموں کو چلایا گیا ان میں حفاظتی اقدامات میں بہتری، قانونی معاملات اور منشیات کے خلاف کاروائی شامل تھی۔ حفاظتی پروگرام میں ایوی ایشن (Aviation) پروگرام بھی شامل تھا جس کا بنیادی مقصد فرنٹیئر کور (Frontier Corps) کو ہوائی مدد فراہم کرنی تھی تاکہ پاکستان افغانستان سرحد پر غیر قانونی منشیات، ہتھیار اور لوگوں کی آمد و رفت کی روک تھام کی جاسکے۔

استحکام کے شعبہ میں لگائی جانے والی کل رقم 765.12 ملین ڈالرز تھی جس میں سے نصف حصہ سڑک اور پانی کے لیے تعمیرات اور بجلی کی پیداوار کے لیے استعمال کیا گیا۔[37] اس کے علاوہ یو ایس ٹی ڈی اے نے بھی اس حوالے سے امدادی کام کیا ہے۔ جس کا مقصد پاکستان افغانستان کے درمیان تجارت کا فروغ ہے۔ ایک طرف کہا جارہا ہے کہ افغانستان اور پاکستان کے درمیان سڑکوں کی تعمیر سے امریکی نجی شعبے کو افغانستان میں تجارت کے لیے آسانی ہوگی اور دوسری طرف یہ کہ سڑکوں کی تعمیر سے افغانیوں اور پاکستانیوں کے تعلق بہتر ہوں گے۔ ان دو مختلف بیانات سے سوال یہ ہے کہ اس تعمیراتی کام کے پیچھے امریکہ کے اصل مفادات کیا ہیں؟ پاکستان میں کئی ملین افغان مہاجرین رہتے ہیں اور افغان پشتون رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ اگر دونوں ممالک میں اختلافات ہیں تو ان کی بنیاد امریکہ اور سابقہ سویت یونین کی جنگ تھی جس کی وجہ سے آج پاکستان ایک بھیانک صورت حال کا سامنا کررہا ہے۔ اگر امریکہ آج اپنی افواج افغانستان سے ہٹا لے اور اس خطے میں اپنا اثر و رسوخ ختم کردے تو پاکستانی اور افغانی عوام بہتر رشتے استوار کرنے کی خود اہلیت رکھتے ہیں۔

استحکام اور فلاح بہبود کے شعبہ پر امدادی پروگرام کو دیکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کے لیے افغانستان / پاکستان میں کیا مخصوص مفادات ہیں جس کی بنیاد پر ای ایس ایف کے تحت امداد فراہم کی جارہی ہے۔ اگر استحکام سے مراد ملک میں امن و امان کے حالات میں بہتری لانی تھی تو چار سال سے زائد عرصے کے بعد بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پاکستان کے کئی حصوں میں آئے دن خودکش حملے جاری ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی عروج پر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکہ کے ڈرون حملوں میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تو پھر اس استحکام منصوبے کی کامیابی کو کیسے ناپا جائے؟

ای ایس ایف کی امداد فوجی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کی جاسکتی اسی لیے یہ فنڈ ایک واضح اشارہ ہے کہ امداد حاصل کرنے والا ملک معاشی ترقیاتی پروگراموں کے لیے جو فنڈ مختص کرنے والا ہو اس کو فوجی ضروریات کی طرف منتقل کردے کیونکہ ای ایس ایف معاشی ترقیاتی پروگراموں میں مدد فراہم کرچکا ہوتا ہے۔ یہاں پر توجہ طلب بات یہ ہے کہ امریکہ پاکستان کی حکومت سے کون سے فوجی اقدامات چاہتا ہے؟ دوسرا سوال جمہوریت کے استحکام پر اٹھتا ہے۔ ہر ملک کی فوج اس کے دفاع کے لیے ضروری ہے۔ امریکہ کو اپنے مخصوص مفادات کے لیے پاکستانی فوج کو استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ اس سے پاکستان میں جمہوریت کمزور ہوجاتی ہے۔

امریکی امداد سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس امداد سے کہاں تک جمہوریت کی خدمت ہوئی، کیونکہ اس امداد سے سرمایہ دار مزید مضبوط ہوجائے گا اور جاگیرداری کو تو توڑنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ یہ ضرور ہوا ہے کہ جیسے جیسے برآمد کنندگان کو فوقیت دی گئی ہے تو کئی جاگیردار گروہ اس بھرپور مدد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیک وقت بڑے جاگیردار اور بڑے سرمایہ دار دونوں بن جائیں گے۔ دولت اور سیاسی طاقت کے یکجا ہونے کے دنیا بھر میں بھیانک اثرات پڑے ہیں۔ پائیدار ترقی کے ہدف کے چناؤ میں عالمی سطح پر عوامی گروہوں نے اپنے مطالبات میں امیر اور غریب ممالک، امیر اور غریب طبقوں اور مرد اور عورتوں کے درمیان غیر منصفانہ اور امتیازی تعلق کو توڑنے پر زور دیا ہے۔

آخر میں بس اتنا لکھنا کافی ہے کہ کیری لوگر بل میں یہ زور دیا گیا تھا کہ اس امداد کے ذریعہ پاکستانی عوام کے امریکی حکومت کے خلاف منفی خیالات کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ کوشش کامیاب نہیں ہوسکی۔ کیری لوگر بل نے بھی وہی کچھ کیا ہے جو کہ پچھلی امریکی امداد نے کیا ہے۔ کیری لوگر بل کے تحت پاکستانی عوام کے آنکھوں میں دھول ڈالی ہے کیونکہ امداد کا 70 فیصد تو ابھی بھی افغان مہاجرین اور پاکستان افغان سرحد پر خرچ کیا گیا جہاں پر امریکی فوجی کئی سالوں سے تعینات ہیں۔

2013 کے بعد سے کیری لوگر بل کے تحت کسی قسم کی مزید ترقیاتی امداد پاکستان کو فراہم نہیں کی گئی۔ پاکستانی اور امریکی حکومت کے درمیان کئی تنازعات اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ یہاں تک کہ کئی امریکیوں کو حکومت پاکستان نے ویزا تک نہیں دیا جو کہ امدادی کام کے حوالے سے ہی پاکستان آنا چاہ رہے تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ

امداد دینے کے لیے جو نئے اصول وضوابط بنائے گئے ہیں اور جن کا ذکر مضمون کے آغاز میں کیا گیا تھا ان کو مدنظر رکھتے ہوئے نہ ہی امداد دی گئی اور نہ ہی امداد لی گئی ہے۔ امداد دینے والے اور امداد لینے والے گروہ دونوں اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے اپنے مفاد کو فوقیت دے رہے تھے اور جھگڑا بھی انہی دونوں گروہوں کے درمیان ہے۔ پاکستانی عوام تو صرف دونوں فریقین کی رسہ کشی میں استحصال کی نظر ہو کر پس رہے ہیں۔ درحقیقت اس ظلم سے چھٹکارا اسی وقت ممکن ہے جب عوام کشکول توڑ کر ملک کی باگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لے لیں گے۔

حوالہ جات

1. OECD. The Paris Declaration on Aid Effectiveness (2005), and Accra Agenda for Action (2008) accessed from http://www.oecd.org/dac/effectiveness/34428351.pdf
2. Tarnoff, Curt and Nowels, Larry. :Foreign aid: an introductory overview of U.S. programs and policy." Congressional Report Service, Report for Congress, April 2004, p. 15, accessed from http://fpc.state.gov/documents/organization/31987.pdf
3. USAID. "USAID in Pakistan: Strengthening our partnership, continuing our progress." 2013, p. 5 accessed from http://issuu.com /usaid/docs/usaid_pakistan_report_2013?e=4465259/4276765
4. Center for Global Development. "Aid to Pakistan by the numbers." Accessed from http://www.cgdev.org/page/aid-pakistan-numbers
5. Center for Global Development. "Pakistan: US development strategy. Aid to Pakistan by the numbers," accessed on December 18, 2014 from www.cgdev.org/page/aid-pakistan-numbers
6. GPO, USA. "S.962 An Act" 11th Congress, 1st Session. Accessed on December 18, 2014 from December 18, 2014 from https://www.govtrack.us/congress/bills/111/s962/text
7. Epstein, Susan B. and Kronstdt, Alan K. "Pakistan: U.S. foreign assistance," Congressional Report Service Report for Congress, July 2013, accessed from https://www.fas.org/sgp/crs/row/R41856.pdf
8. USAID, Department of State, and Department of Defense. "Quarterly Progress and Oversight Report on the Civilian Assistance program in Pakistan as of March 31, 2013, p. 8." Accessed from https://oig.usaid.gov/sites/default/files/audit-reports/Pakistan_ Quarterly_Report_as_of_03312013.pdf
9. Ibid.
10. USAID. "US AID: Pakistan." Accessed from http://www.usaid.gov/pakistan KHALID MUJH SA LIKHWAE….
11. Agribusiness Support Fund. "USAID and ASF launch the Agribusiness Project." Accessed on December 18, 2014 from http://www.asf.org.pk/USAIDproject.php
12. USAID: The Agribusiness Project. "Increasing exports of Pakistani fruits and vegetables." Accessed on December 18, 2014 from www.agribusiness.org.pk/node/110
13. Office of Inspector General, USAID. "Audit of USAID/Pakistan's Pakistan strategy support program." Audit Report No. G-391-14-004-P, July 30, 2014, Islamabad, Pakistan. Accessed from http://oig.usaid.gov/sites/default/files/audit-reports/g-391-14-004-p.pdf
14. International Food Policy Research Institute. "IFPRI: Pakistan". Accessed from http://www.ifpri.org/category/country/ south-asia/pakistan
15. Rana, Mohammad Ahsan. "The seed industry in Pakistan: regulation, politics and entrepreneurship." Working Paper No. 019. Pakistan Strategy Support Program, International Food Policy Research Institute, and USAID, February 2014.
16. USAID. "Pakistan modernizes sheep shearing for greater profits." Accessed on December 14, 2014 from http://www.usaid.gov/results-data/success-stories/pakistan-modernizes-sheep-shearing-greater-profits
17. USAID. "US AID: Pakistan." Accessed from http://www.usaid.gov/pakistan
18. Ibid.
19. USAID, Department of State, and Department of Defense. "Quarterly Progress and Oversight Report, p.20.
20. Ibid, p. 4,7.
21. United States Department of Agriculture, Foreign Agriculture Service. " U.S. Foreign Military Assistance" accessed from http://www.fas.org/asmp/profiles/aid/aidindex.htm
22. United States of America, Department of Commerce, International Trade Administration. "U.S. Commercial Service." Accessed from http://www.trade.gov.cs/
23. U.S. Commercial Service. "U.S. free trade agreements." Accessed from http://export.gov/fta/
24. Embassy of the United States, Islamabad Pakistan. "U.S. Commercial Service for Pakistan." Accessed on December 15, 201 from http://islamabad.usembassy.gov/us-commercial-service-pakistan.html
25. U.S. Commerical Service. "Doing business in Pakistan: 2014 Country Commercial Guide for U.S. Companies," accessed from http://photos.state.gov/libraries/pakistan/231771/PDFs/pakistan-ccg-2014.pdf
26. Ibid.
27. Sayeed, Azra Talat. "The Impact of General Agreement on Tariffs And Trade on the pharmaceutical sector in the third world." University of Minnesota. 1995.
28. Please see Wali Haider's article in this volume of Challenge
29. UC Davis to lead new USAID program to develop disease-resistant, heat-tolerant chickens for Africa, University of California, Davis, October 30, 2013, accessed from http://news.ucdavis.edu/search/news_detail.lasso?id=10759
30. U.S. Government's Global Hunger and Food Security Initiative. "Focus areas: private sector engagement." Accessed from http://www.feedthefuture.gov/approach/Private--Sector--Engagement#focus-areas
31. USAID and Agribusiness Support Fund. "Agribusiness Quarterly", July-September, 2012. Accessed on December 15, 2014 from agribusiness.org.pk
32. World Wide Sires. "World Wide Sires", accessed from http://www.wwsires.com
33. Government of Pakistan, Ministry of Finance. "Pakistan Economic Survey 2013-14: Agriculture." Ministry of Finance, p. 39, accessed from http://finance.gov.pk/survey/chapters_14/02_Agriculture.pdf
34. USDA. " Faith-based and Neighborhood Partnerships." Accessed on November 15, 2014 from http://www.usda.gov/wps/portal/ usda/usdahome? contentid=fbnp_page01-1C.xml
35. Baloch, Farooq. "No US visa for Pakistani mangoes." The Express Tribune, March 16, 2014. Accessed from http://tribune.com.pk/story/683575/no-us-visa-for-pakistani-mangoes/
36. USAID, Department of State, and Department of Defense. "Quarterly Progress and Oversight Report, p. 20.
37. USAID, Department of State, and Department of Defense. "Quarterly Progress and Oversight Report, pp. 25-27.

ملٹی نیشنل کمپنیاں: نوآبادیات سے دور گلوبلائزیشن تک کا سفر

تحریر: ثناء شریف

اس میں شک نہیں کہ تجارتی کمپنیوں کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت رکھی گئی اور اس نظام کا استحکام آزاد تجارت کے نظریئے سے جڑا ہے۔ اس نظریئے کے فروغ کے لیے مختلف مالیاتی اداروں، مشترکہ منڈیوں اور بین الاقوامی کمپنیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی ترقی کو قبول کرنے والے سب سے پہلے یورپی ممالک تھے۔ اس نظام نے آج سے تقریباً 500 سال پہلے نوآبادیات کے ذریعہ اپنے سرمائے میں بے تحاشہ اضافہ کیا۔ یورپی ممالک کا ایشیاء اور افریقی ممالک سے تجارت کا آغاز ہوا نوآبادیات قائم کرنے اور ان کے وسائل تک رسائی کے لیے سمندری راستوں کے ذریعے تجارت عام کی گئی۔ یہ ممالک نوآبادیات سے خام مال کی برآمد اور مزدوروں کی زائد محنت کی بنیاد پر تیار کردہ مصنوعات انہی کی منڈیوں میں فروخت کے لیے پیش کیا کرتے تھے۔ اسی لیے ایک طرف نوآبادیات کی پیداواری صلاحیت اور آزادی کو جبراً مفلوج کیا گیا اور دوسری طرف ان علاقوں میں ''آزاد تجارت'' کے نام پر ان ہی کے خام مال سے تیار کردہ مصنوعات درآمد کر کے کئی ہزار گنا منافع کمایا گیا یا یوں کہہ لیں کے لوٹ مار کو جائز قرار دیا گیا۔ اسی بنیاد پر برطانیہ دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر قابض ہو کے سب سے بڑی سامراجی قوت کے طور پر ابھری۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب برطانیہ کی صنعتوں نے اعلیٰ تکنیکی مہارت حاصل کر لی تو اس ہی مہارت کے بل بوتے پر آزاد تجارت کے تصور کو اپنے فائدے لیے استعمال کیا۔ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک نے ترقی اور منڈیوں پر اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے آزاد تجارت کو فروغ دینے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ جن میں سب سے اہم ملٹی نیشنل کمپنیوں کا وجود میں آنا تھا جس کی سب سے معروف مثال برطانیہ کی پہلی قائم کردہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہے۔1

برطانیہ کی جنوبی افریقہ میں قائم کردہ پہلی نوآبادی ''کیپ کالونی'' کہلاتی تھی۔ جس کے ساتویں برطانوی وزیر اعظم سیسل روڈز (Cecil Rhodes) تجارت بڑھانے کے لیے نوآبادیات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ ''ہمیں ایسی زمین کی تلاش کرنی ہے جہاں بیک وقت آسانی سے خام مال اور سستے غلام مزدور حاصل کر سکیں اور یہ دونوں چیزیں ہمیں نو آبادیات کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری صنعتوں میں تیار زائد اشیاء پیداوار کی کھپت کے لیے یہ نو آبادیات بہترین منڈیاں فراہم کریں گی''۔2

ملٹی نیشنل کمپنیوں کا وجود تیسری دنیا کے لیے نیا نہیں ہے بلکہ ان کمپنیوں کو سامراج یا نوآبادیاتی نظام کا حصہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کمپنیوں کی ابتداء سولہویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور کئی سالوں تک چلتی رہی۔ پیش کردہ مضمون میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے کہ کس طرح دور نوآبادیات کے بعد دور عالمگیریت میں ان کمپنیوں کا قیام عمل میں آیا اور آج اکیسویں صدی میں ان کمپنیوں کی اجارہ داری کی ایک جھلک کچھ شعبہ جات میں پیش کی گئی ہے۔

ملٹی نیشنل کمپنیاں مقامی اور قومی حکومتوں پر اجارہ داری کے ذریعے جدید تکنیک اور ملکیتی حقوق کے حوالے سے طاقتور حیثیت رکھتی ہیں۔ مختلف ریاستیں ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو مقابلہ سازی اور پرکشش سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کمپنیوں کی ریاست میں وسیع پیمانے پر سرمایہ کے لیے مختص کی گئی رقم کی واپسی اس ریاست کی حکومتی پالیسیوں کے لیے ہمیشہ خطرہ بنی رہتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کمپنیاں اشیاء، خدمات، سرحد پار نقل و حرکت میں اضافہ کے ذریعے دنیا بھر کی قومی معیشتوں کے باہمی انحصار میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ وہی دوسری طرف ان کمپنیوں کے ذریعے مقامی مزدوروں کے استحصال میں اضافہ اور ملکی وسائل غیر ملکی برآمدات کی نظر ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے ترقی پذیر ممالک کی زیادہ تر معیشتیں پہلی دنیا کے ممالک پر انحصار کرنے لگتی ہیں۔

عام الفاظ میں ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو یوں بیان کیا جاتا ہے:

> ''بین الاقوامی کمپنیاں ایسا کاروباری ادارہ کہلاتا ہے جو ایک سے زائد ممالک میں پیداوار کے انتظام اور خدمات فراہم کرتا ہے''۔3

ملٹی نیشنل کمپنیاں زمانہ نوآبادیات میں

ایسٹ انڈیا کمپنی

ایسٹ انڈیا کمپنی، ایسٹ انڈیز اور مشرق بعید میں 1600 کے آخر میں تجارت سے بے تحاشہ منافع کمانے والی آٹھ کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ دیگر سات تجارتی کمپنیاں ہالینڈ، فرانس، ڈنمارک، اسکاٹ لینڈ، اسپین، آسٹریلیا اور سوئیڈن میں قائم کی گئیں، لیکن ان سات میں سب سے زیادہ اہمیت ایسٹ انڈیا کمپنی کو حاصل ہوئی۔ یہ کمپنی ایشیائی خطے کے ممالک کے ساتھ منافع بخش تجارت کو بڑھانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔

ڈچ (ہالینڈ کے باشندے) انڈونیشیا کے مختلف جزیروں سے مصالحہ جات کی تجارت پر سخت اجارہ داری قائم کیے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف برطانوی تاجران

مصالحہ جات کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے سبب تشویش میں مبتلا تھے۔ لہٰذا اس اجارہ داری کے خاتمے اور ڈچ تاجروں کا مقابل کرنے کے لیے برطانیہ کی ملکہ الزبتھ اول نے برطانوی تاجروں کے طلب کردہ اجلاس میں تجارتی کمپنی قائم کرنے اور بحری جہازوں کے حصول کا فیصلہ کیا۔ یہ کمپنی برطانیہ ہندوستان سے غیر ملکی درآمد (خاص کر کپاس، چائے اور ریشم) پر اجارہ داری برقرار رکھتے ہوئے دنیا کی سب سے طاقتور تجارتی تنظیم کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اجارہ داری پر مبنی تجارت شروع کرنے والی کمپنی سیاست میں ملوث ہو کر اٹھارویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے وسط تک برطانوی سامراج کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتی رہی۔4

عام لفظوں میں یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں نوآبادیات کے مستقبل کو وضع کرنے کے لیے سب سے زیادہ طاقتور انسانی تنظیم تصور کی جاتی تھیں۔ ان کے تحت دنیا کو واضح اور وسیع پیمانے پر وسائل ایک سے دوسری صنعت اور ایک ملک سے دیگر ممالک آزادانہ منتقل کرنے کے مواقع فراہم کرنا، اپنے منافع کو حد سے تجاوز کر لینا اور اس منافع کے ذریعے ایک منفرد طاقتور ادارے کی حیثیت حاصل کر لینا ان کمپنیوں کے واضح مقاصد تھے۔5

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ برطانوی راج نے آزاد تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کے لیے تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو کسی قاعدے قانون کے تحت چلانے کے لیے ریاست کی طرف سے کمپنیوں کے لیے چارٹر تشکیل دیا گیا۔ جس کی تاریخ ہمیں سولہویں صدی میں ملتی ہے۔ اس وقت کے تاجران کو مشرقی انڈیز سے مصالحہ جات کے کاروبار کے لیے برطانیہ تک کے سمندری سفر میں ناگزیر حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ اکثر خراب موسمی حالات اور بحری قزاقوں کی تجارتی سامان کی لوٹ مار کا شکار ہو جایا کرتے تھے۔ تاجروں کے انفرادی طور پر لیے جانے والے قرض کی ادائیگی نا کرنے کا خمیازہ ان کی نسلوں کو قید کی صورت میں بھگتنا پڑتا تھا۔ اس وقت ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو تاجروں کے کاروباری نقصان کو پورا کرنے کے لیے جدید ادارے کے طور پر پیش کیا گیا۔ چارٹر کی بنیاد پر ریاست کی طرف سے سرمایہ کاروں کو تجارتی نقصان کی صورت میں سرمائے کی واپسی کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ برطانوی راج پہلے سے ہی ہر کمپنی سے ملنے والے منافع کی شرح طے کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے مخصوص حقوق اور ذمہ داریاں دونوں طے ہوجاتی تھیں۔ ان کمپنیوں کو مختص کردہ منافع کی ادائیگی پر ذاتی تعلقات کی بناء پر خصوصی رعایت حاصل تھی۔ اس طرح کے کئی چارٹر شاہی فرمان کی صورت میں عطا کیے بھی جاتے تھے اور مخصوص منافع نہ حاصل ہونے پر واپس بھی لے لیے جاتے تھے۔6

تجارتی کمپنیاں نوآبادیات کے دور کے بعد

برطانوی سامراج کے بعد ان تجارتی کمپنیوں نے ان ممالک کی سیاسی اور اقتصادی مفادات کی نمائندگی کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں امریکہ جو برطانیہ کی ایک کالونی تھی، نے برطانوی سامرج کی اقتصادی اور بحری طاقتوں سے طویل اور سخت جدوجہد کے ذریعے خود کو آزاد کرایا۔ اس وقت امریکہ کے تشکیل دیئے گئے آئین میں کمپنیوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس لیے ملک میں ریاست اور کمپنیوں میں رسہ کشی کی کیفیت واضح تھی۔7 امریکی ریاست ان کمپنیوں کی ذمہ داریوں کو محدود کرنے کی طرف مائل تھی۔ کمپنیوں کے لیے چارٹر کو جاری اور برقرار رکھنے کا اختیار انفرادی طور پر ریاست کے پاس تھا نہ کہ مرکزی حکومت کے پاس، تا کہ کمپنیوں کی کارکردگی پر ضوابط کا اختیار زیادہ سے زیادہ شہریوں کے ہاتھوں میں دیا جاسکے۔ اس دور میں کمپنیوں کے لیے تشکیل دیئے جانے والے چارٹر میں کمپنیوں کا منافع محدود کرنے کے لیے شخصی بنیادوں پر متعدد قوانین موجود تھے۔ ابتدائی دور میں تجارتی چارٹر محدود مدت کے لیے مقرر کیے جاتے تھے اور وقت ضرورت ان کی تجدید نہ ہونے کی صورت میں یہ تحلیل کردیے جاتے تھے۔ یہ چارٹر کمپنیوں کے لیے زمین کی ملکیت، منافع اور قرض کے حصول کے لیے حدود مقرر کرتا تھا۔ کسی بھی کمپنی کے ارکان اپنے دور رکنیت میں لیے جانے والے قرضوں کے ذمہ دار مانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے اور بڑے سرمایہ کاروں کو مساوی حق رائے دہی دیا گیا تھا۔ قانون ساز اداروں کو ان تجارتی کمپنیوں کے مختلف امور پر نظرثانی سمیت عوامی خدمات میں ناکامی پر تجارتی چارٹر کو واپس لینے کا اختیار حاصل تھا۔8

انیسویں صدی میں امریکہ میں کمپنیوں پر ریاست اور عوام کی روک ٹوک کو شدید دھچکا لگنا شروع ہو گیا۔ 1886 میں امریکی سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ امریکی قانون کے مطابق نجی کارپوریشن ایک قدرتی انسان یا فرد کی حیثیت رکھ سکتی ہے اور اس لیے کارپوریشن بل آف رائٹس (Bill of Rights) کے تحت ملنے والے حقوق کو حاصل کرسکتی ہے۔ ان حقوق میں اظہار رائے کی آزادی اور دیگر آئینی تحفظ جو فرد واحد کو حاصل ہیں وہ کمپنیوں کو بھی دیئے جائیں گے۔9

درحقیقت آج دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ میں ان کارپوریشنوں کی قانونی حیثیت (legal status) بڑے غیر حقیقی انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ ریاست کی طرف سے ان کارپوریشنوں کو (چارٹر) عام افراد کے برعکس لاءمحدود زندگی کی بنیاد پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کی قانون سازی کا مقصد ان کمپنیوں کو فرد واحد کی حیثیت پر مبنی حقوق فراہم کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ان کمپنیوں کے انفرادی آئینی حقوق کی ضمانت کے طور پر عدالتوں کو توسیع دی گئی۔ جس کے تحت ان کمپنیوں کو قانونی تحفظ، اظہار رائے کی آزادی، خود کو الزام دہی سے محفوظ رکھنے اور مختلف ممالک میں وسائل کی نامناسب طریقوں سے تلاش کی آزادی فراہم کی گئی۔ اس چارٹر میں تمام قانونی حقوق صرف ایک غیر حقیقی شخص (کمپنی) کے لیے تشکیل دیے گئے ہیں۔ ان ملٹی

نیشنل کمپنیوں کی قانون میں انفرادی حیثیت کے حوالے سے بہت سے سوالات نے جنم لیا ہے کہ کئی ملکوں میں بیک وقت سرمایہ کاری کر کے منافع حاصل کرنے والی کمپنیاں کس طرح انفرادی حیثیت کے زمرے میں آتی ہیں؟[10]

امریکی قانونی مصنف رچرڈ ایل گراسمین (Richard L. Grossman) ملٹی نیشنل کمپنیوں کے قیام کو کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

> ''آج کی کاروباری کمپنی ایک مصنوعی تخلیق ہے۔ یہ کمپنیاں مصنوعی ہیں یا نہیں لیکن ان کمپنیوں نے شہریوں کے مقابلے اپنے لیے زیادہ قانونی حقوق جیت لیے ہیں اور ان حقوق کو حکومت نے اپنی مسلح طاقت سے تحفظ دیا ہے''۔[11]

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکی کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر غیر ملکی سرمایہ کاری میں حصہ لینا شروع کیا۔ 1950 کی دہائی میں امریکہ، برطانیہ اور جاپان کے مالیاتی اداروں نے کمپنیوں کے استحکام کی غرض سے صنعتی شعبہ جات، ان کمپنیوں کے الحاق اور منافع کے نئے مواقعوں کی تلاش کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری شروع کی اور ساتھ ہی بحری، ہوائی نقل وحمل اور مواصلات کے جدید تکنیکی نظام کو ترقی دی گئی۔ کمپنیوں کی مصنوعات کی فروخت کے لیے نئے اشتہاری طریقے تشکیل دیئے گئے تا کہ منڈی میں ان کے حصص (share) کو توسیع دی جاسکے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے سبب 1990 میں ان کمپنیوں کی تعداد 7,000 سے 38,000 ہزار تک جا پہنچی۔ ان میں سے 90 فیصد کمپنیاں صنعتی ممالک سے تعلق رکھتی تھیں۔[12]

دور عالمگیریت اور تجارتی کمپنیاں

1990 کی دہائی میں کمپنیوں کے حجم کو بڑھانے اور سرحد پار موجود کمپنیوں سے الحاق کا وسیع رجحان دیکھنے میں آیا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود امریکی، برطانوی اور جاپانی کمپنیوں نے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے کو آگے بڑھانے کے لیے خود کو مربوط رابطہ سازی کے ذریعے تبدیل کیا۔ اس تبدیلی کے عمل میں ملازمتوں کی چھانٹی، رابطوں کا جدید انتظام، کمپنیوں کا انضمام اور مرکزی دفاتر کے قیام جیسی تبدیلیاں شامل تھیں۔ 1994 میں پہلی دنیا کے اشرافیہ نے ''دنیا پر راج'' (new world order) کرنے کے سازشی فلسفہ کو فروغ دیا۔ اس فلسفہ کی بنیاد پر حکومتی پالیسیوں میں آزاد تجارت کی آسان شرائط کے ساتھ شمولیت کو یقینی بنانے کی غرض سے عالمی تجارتی ادارہ (ڈبلیو ٹی او) کا قیام عمل میں لایا گیا اور آج ان دیگر سرمایہ دارانہ اداروں کے رائج کردہ تجارتی قوانین کے تحت دنیا بھر میں مختلف شعبہ جات میں دیوہیکل کمپنیاں اپنے پنجے گاڑے بیٹھی ہیں۔[13]

عالمی تجارتی کمپنیاں اپنے حجم، نقل وحرکت کے وسیع ذرائع اور حکمت عملی کی بنیاد پر دنیا کے پیداواری نظام پر قبضہ جمانے میں مصروف ہیں۔ جو مال و دولت کے حصول اور دنیا میں نئے وسائل کی تلاش کے لیے سرگرداں دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کمپنیوں کو سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے زیادہ متحرک مہرہ مانا جاتا ہے۔[14] تیسری دنیا کے حکمران اور معاشی تجزیہ کار ان کمپنیوں کو معاشی ترقی اور غربت کے خاتمے کا ضامن قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ ریاست کی ذمہ داریوں میں شہریوں کے حقوق کی حفاظت، معاشی ترقی کے ڈھانچے کو مستحکم بنانا اور عوام کی غذائی ضروریات پوری کرنے جیسے فرائض شامل ہیں لیکن ہمارے حکمران اپنی طاقت اور منافع کی ہوس میں عوام کی ضروریات اور مقامی صنعت کا مستقبل داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ حکمران ان بین الاقوامی کمپنیوں کو عوام دشمن تجارتی معاہدوں کی بنیاد پر اپنی منڈیوں میں سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

دنیا بھر کی معیشتوں اور اقتصادی طاقت کے پیمانے کی جانچ کرنے والے ادارے کے مطابق دنیا کی 100 سب سے بڑی معیشتوں میں پچاس تجارتی کمپنیاں شامل ہیں۔ 1991 میں دنیا کی دس بڑی کمپنیوں کی مجموعی فروخت دنیا کی 100 سب سے چھوٹے ممالک کی مجموعی قومی آمدنی سے تجاوز کر گئی تھی۔ 1992 میں جنرل موٹرز کی مجموعی فروخت کا اندازہ 133 بلین ڈالرز لگایا گیا جو کئی ممالک تنزانیہ، ایتھوپیا، نیپال، پاکستان، بنگلہ دیش، یوگینڈا، نائیجریا، کینیا کی مشترکہ قومی پیداوار کے برابر تھی۔[15]

مضمون کے اگلے حصہ میں دنیا کے چند اہم شعبہ جات جیسے زراعت، ادویات اور کریانہ کی خرید و فروخت کے شعبے میں موجود بین الاقوامی کمپنیوں کے وسیع دائرہ کار اور ان کمپنیوں کا نئی ٹیکنالوجی کو بروئے کار لا کر عالمی تجارتی منڈیوں میں ان کے حجم کا جائزہ لیا جائے گا۔

عالمی سطح پر زراعت کے شعبہ میں چند دیوہیکل کمپنیوں کا قبضہ

1935-1989 کے دوران امریکہ میں چھوٹے فارمز (کھیت) کی تعداد 6.8 ملین سے گھٹ کر 2.1 ملین رہ گئی۔ اسی عرصے کے دوران امریکہ کی آبادی میں بھی دگنا اضافہ سامنے آیا۔ چنانچہ خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے لیے متعدد مقامی ترسیل کاروں (suppliers) اور بیوپاریوں (dealers) کو مقرر کیا گیا اور چھوٹے کسانوں کو اس کاروبار سے علیحدہ کر دیا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت کثیر دیہی مقامی آبادیاں زراعت جیسے شعبہ میں گمنامی کا شکار ہوگئی تھیں۔ زراعت کو کاروبار کا درجہ دے کر کئی عالمی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ امریکہ کے دس بڑے فارم اب ملٹی نیشنل کمپنیوں کے نام سے جانے جاتے ہیں مثلاً پلگرمز پرائیڈ (Pilgrim's Pride)، پرڈو فارمز (Perdue Farms)، کون آگرا فوڈز (ConAgra Foods)، گولڈ کسٹ

(GoldKist)، کونٹینینٹل گرین کمپنی (Continental Grain Company)، ٹائسن فوڈز (Tyson Foods) اور کارگل (Cargill) جو اب بیج اور ادویات کی بڑی کمپنی مونسانٹو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ان ملٹی نیشنل کمپنیوں نے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے خاص کر زراعت میں بیج، کھاد، کیڑے مار ادویات کو صنعت کا درجہ دے کر تجارتی بنیادوں پر استوار کر دیا ہے۔[16]

بیج کا کاروبار کرنے والی بین الاقوامی کمپنیاں

انسانی زندگی کے آغاز کے بعد جب انسان نے اپنی بقاء کے لیے بیج دریافت کیا تو اس وقت سے ہی بیج کو اگانے والے کی ملکیت اور فخر تصور کیا جانے لگا۔ پہلی دنیا کے ممالک نے خوراک پر قبضے کے لیے بیج کو کاروباری جنس بنا دیا اور بیج جو خوراک کی پیداوار کا بنیادی جز سمجھا جاتا ہے اسے جدید ٹیکنالوجی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ بیج کا کاروبار کرنے والی ان ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ذہنی ملکیت کے معاہدوں (Intellectual Property Rights) جیسے ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے ہوئے بیج کو تجارت کے شعبے سے منسلک کر کے تجارتی جنس کے طور پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ ان کمپنیوں کا مقصد روایتی بیجوں کے خاص بنیادی جرثومہ (germplasm) پر قبضہ کرتے ہوئے غیر مصنوعی اور غیر معیاری بیج تخلیق کر کے اس بیج پر کسانوں کے حقوق کا خاتمہ کرنا تھا تا کہ وہ اس سے منافع کما سکیں۔

1990 کی دہائی میں کمپنیوں کے تعاون اور استحکام کی غرض سے متعدد دوا ساز کمپنیاں اور کیمیائی کمپنیوں کا الحاق سامنے آیا۔ مثال کے طور پر بیج کا کاروبار کرنے والی کمپنی مونسانٹو زرعی شعبے میں توجہ مرکوز کرنے سے پہلے دوا ساز کمپنی فارمیسیا (Pharmacia) اور اپ جان (Upjohn) سے الحاق شدہ تھی۔ اسی طرح سینجنٹا کے نووارٹس (Novartis) اور زینیکا (Zeneca) جبکہ بائیر کا ایونٹس (Aventis) کے ساتھ الحاق سامنے آیا۔ 2009 میں کیمیائی اور دوا سازی کی چھ بڑی کمپنیاں بیج کی صنعت پر غالب نظر آئیں۔ ان کمپنیوں کے اتحاد کا مقصد زراعت کے شعبے میں بیج جیسے اہم عنصر کی جینیاتی انجینئرنگ کی تکنیک کے ذریعے افزائش کرنا تھا۔ مونسانٹو (Monsanto) نے جینیاتی انجینئرنگ کی بدولت زرعی شعبہ میں کئی غیر فطری طریقوں سے جینیاتی بیج کو فروغ دیا۔ اس کمپنی نے روایتی بیجوں کے بنیادی جرثوموں تک رسائی کے لیے متعدد بیج کمپنیوں کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ بیج کے حوالے سے بڑی کمپنی کارگل جو کہ متعدد جینیاتی ٹیکنالوجی کی حامل کمپنی تھی، نے بین الاقوامی سطح پر اپنے بیجوں کا کاروباری حصہ مونسانٹو کو فروخت کر دیا۔ 1999 میں مونسانٹو سے الحاق کے بعد ان دونوں کمپنیوں نے 50 ملین ڈالرز کے مشترکہ منصوبے شروع کیے۔ مونسانٹو نے کئی نئی چھوٹی اجناس اور سبزیوں کے بیج کی غیر ملکی کمپنیوں کو خرید کر سبزیوں اور اجناس کے غیر ملکی بیجوں کو فروغ دیا۔ 2004 میں مونسانٹو نے ایک کمپنی امریکن سیڈ (American Seed Inc) کے نام سے قائم کی جس کا مقصد روایتی بیجوں کے بنیادی جرثومہ سے مواد اٹھا کر کسانوں کے لیے نئے اقسام کے بیج کو تیار کرنا تھا تا کہ خود کو ان بیجوں کی ملکیت کا دعویدار ٹھہرایا جا سکے۔[17]

ای ٹی سی گروپ کے مطابق اس وقت عالمی سطح پر دس بڑی امریکی اور یورپی کمپنیاں مونسانٹو، ڈوپونٹ (DuPont)، سینجنٹا، گروپ لیماگرین (Groupe Limagrain)، لینڈ و لیکس (Land O' Lakes)، کے ڈبلیو ایس اے جی (KWS AG)، بائیر، ساکاٹا (Sakata)، ڈی ایل ایف ٹرائیفولیم (DLF-Trifolium) اور ٹاکی (Takii) بیج کے کاروبار پر قابض ہیں۔ عالمی منڈی میں ان دس بڑی کمپنیوں کا مجموعی منافع 14,785 ملین ڈالرز ہے جو عالمی بیج کی منڈی میں 67 فیصد کی حصہ دار ہیں۔[18]

عالمی منڈی میں ان دس بڑی کمپنیوں میں سے امریکی کمپنی مونسانٹو کا بیج کے کاروبار کی عالمی منڈی میں 23 فیصد حصے ہے۔ اس کمپنی کا وسیع دائرہ کار 21,000 ہزار سے زائد ملازمین کے ساتھ دنیا کے مختلف خطوں کے 66 ممالک میں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بیج کا کاروبار کرنے والی دو بڑی کمپنیاں ڈوپونٹ 15 فیصد اور سوئٹزرلینڈ کی کمپنی سینجنٹا بیج کے کاروبار کی عالمی منڈی میں نو فیصد حصہ رکھتی ہے۔ یہ تین بڑی کمپنیاں مجموعی طور پر عالمی منڈی میں 82 فیصد بیج کے کاروبار پر حاوی ہیں۔ یہ کمپنیاں اپنی مصنوعات کے لیے مخصوص شناختی نشان (Logo) اور نام استعمال کرتے ہوئے اپنی اجارہ داری قائم کر رہی ہیں۔ اسی لیے یہ کمپنیاں قطعی نہیں چاہتی کہ کسان اپنا روایتی بیج محفوظ کریں۔[19]

2008 میں عالمی غذائی بحران کی شدت کے ساتھ ہی بیج کا کاروبار کرنے والی ان کمپنیوں کے منافع میں خطرناک حد تک اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اسی لیے 2008 میں مونسانٹو کمپنی کے منافع میں 42 فیصد اضافہ ہوا۔ ان کمپنیوں نے منڈی میں اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے جینیاتی بیج کو غذائی بحران اور موسمیاتی تبدیلی کے حل کے طور پر پیش کیا ہے اور اس جینیاتی بیج کے ذریعے حکومت، کسانوں اور صارفین کو نامساعد موسمی حالات میں بھی زرعی پیداوار کا یقین دلایا گیا۔ مونسانٹو کے مطابق:

''ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ پرانے روایتی طریقہ کار اس قابل نہیں رہے کہ ان بدلتے موسمی حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ ایسے میں صرف ایک امید مخصوص آب و ہوا کے لیے تیار کردہ جینیاتی بیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔''

جینیاتی تبدیلی کے حامل بیج پر دنیا کے کئی حصوں میں شدید تنقید پائی جاتی ہے۔ کئی سائنس دان جینیاتی بیج کے ماحول میں رہنے والے جانداروں پر اثرات کے لیے فکر مند ہیں۔ کسان دوست ماحول کے حامی گروہوں کا خیال ہے کہ مالکانہ حقوق کی حامل یہ جینیاتی ٹیکنالوجی موسمیاتی تبدیلی میں کسانوں کے لیے کبھی معاون ثابت نہیں ہو سکتی۔ دراصل اس جدید ٹیکنالوجی کا مقصد کارپوریٹ شعبے کی طاقت اور منافع

بڑھاتے ہوئے کسانوں کا اپنے بیجوں کو محفوظ کرنے اور تبادلہ کرنے کے حق کا خاتمہ کرنا ہے۔[20]

کھاد کی صنعت کا فروغ

1960 کی دہائی میں زراعت کے شعبے میں کھاد کو زائد پیداوار اور اعلیٰ معیار کی فصل کے حصول کی غرض سے متعارف کرایا گیا۔ خاص کر ایشیاء اور لاطینی امریکہ کے زرعی شعبے میں صنعتی ترقی کے فروغ نے کھاد کی عالمی منڈی کو بھی بڑھاوا دیا۔ عالمی سطح پر ایشیائی خطے میں کھاد کا استعمال 65 فیصد ہے اور اس کی شرح میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 2008 میں عالمی سطح پر کھاد کی بڑھتی ہوئی مانگ نے کئی بین الاقوامی کھاد تیار کرنے والی صنعتوں کے لیے اس منڈی میں تجارتی دروازے کھولے۔

کھاد کی عالمی کمپنیوں میں ناروے کی یارا (Yara) کمپنی اس وقت یورپی منڈی میں 23 فیصد حصے کے ساتھ پہلے نمبر پر ہے۔ اس کمپنی نے 2010 میں امریکی کمپنی ٹیرا (Terra) کے ساتھ نائٹروجن کھاد کی پیداوار بڑھانے کے لیے 4.1 بلین ڈالرز کے بڑے معاہدے کیے۔[21] یارا کمپنی 50 ملکوں میں اپنے انتظامی امور کے ساتھ 120 ممالک میں کھاد کی درآمد کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور عالمی سطح پر امونیا کی تیاری میں خاص صلاحیت کی حامل ہونے کے علاوہ امونیا کی تجارت کے ایک چوتھائی حصہ کی مالک بھی سمجھی جاتی ہے۔ کھاد کی تیاری میں نائٹروجن، فاسفورس، قدرتی گیس اور پوٹاشیم جیسے بنیادی اجزاء درکار ہوتے ہیں۔ اس لیے نائٹروجن کھاد کی پیداوار کے لیے قدرتی گیس کی دستیابی ضروری ہے۔ جبکہ قدرتی گیس کا حصول مشکل اور نسبتاً مہنگا تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے ملٹی نیشنل کمپنیاں ایسے علاقوں کو ترجیح دے رہی ہیں جہاں کم لاگت میں گیس کے ذخائر سے نائٹروجن کھاد تیار کی جاسکے۔ اس مقصد کے لیے یارا کمپنی نے لیبیا میں ایک مشترکہ منصوبے کے تحت قطر، روس اور الجیریا میں نئے امونیا پلانٹ کی تعمیر کے لیے معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔

عالمی سطح پر کھاد کا کاروبار کرنے والی دوسری بڑی امریکی کمپنی موزیک (Mosaic) کے نام سے 2004 میں قائم کی گئی۔ اس کمپنی کو فاسفیٹ کی تیاری میں 9.4 ملین ٹن اور پوٹاش کی تیاری میں 10.4 ملین ٹن کی صلاحیت کے ساتھ عالمی سطح پر دوسری بڑی کمپنی مانا جاتا ہے۔ اس کمپنی کا مقصد دنیا بھر کی اہم زرعی منڈیوں میں اپنی پیداوار کی کھپت کو یقینی بناتے ہوئے اپنے منافع کو بڑھانا ہے۔ مذکورہ کمپنی برازیل میں کھاد کے لیے خام مال فراہم کرنے والی کمپنی فوسفرٹیل ایس اے (Fosfertil S.A) میں 20 فیصد اثاثوں کے علاوہ ارجنٹائین میں مخصوص اشیاء گرینولیٹیڈ سنگل سوپر فاسفیٹ (Granulated Single Super Phospate) بنانے والے ایک پلانٹ کے 35 فیصد مالکانہ حقوق رکھتی ہے۔[23]

کھاد کی تیاری میں عالمی سطح پر کینیڈین کمپنی پوٹاش کارپوریشن (Potash Corporation) عالمی پوٹاش کی پیداواری صلاحیت میں 22 فیصد کی حصہ دار ہے۔ کھاد کی بڑھتی ہوئی عالمی طلب کو دیکھتے ہوئے کمپنی نے اپنی پیداواری صلاحیت 10.8 ملین ٹن سے بڑھا کر 2015 کے آخر تک 17.2 ملین ٹن تک لے جانے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ اس حوالے سے خاص حکمت عملی کے تحت پوٹاش کا کاروبار کرنے والی چار غیر ملکی کمپنیاں عرب پوٹاش کمپنی (Arab Potash Company)، اسرائیل کیمیکل لمیٹڈ (Israel Chemical Ltd)، چلی سوسائٹیڈ کیومیسیا (Chille Sociedad Quimicia)، سائینوفرٹ (Sinofert) میں مجموعی طور پر 90 فیصد سرمایہ کاری کررہی ہے۔[24]

کھاد کے فصلوں میں استعمال سے ماحولیاتی نظام کو ناقابل تلافی نقصان کا سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بڑے پیمانے پر کھاد کی تیاری میں استعمال کیے جانے والے فاسفیٹ کے ذخائر کا جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ مصنوعی کھاد کے استعمال سے نائٹروجن کا مخصوص حصہ پودوں تک پہنچ پاتا ہے جب کہ اس کھاد کا بڑا حصہ مٹی اور پانی میں شامل ہوکر زمین کی زرخیزی کو ختم کرتا ہے۔ 2008 میں جریدے ''سائنس'' کے مطابق دنیا بھر کے تقریباً 400 ساحلی علاقوں میں آبی حیات کھاد کے زائد استعمال کی وجہ سے آکسیجن کی کمی کا شکار ہوکر مردہ پائی گئی۔[25]

کھاد سے جہاں ماحولیاتی نظام پر اثرات مرتب ہوتے ہیں وہی کسانوں کی زندگی پر بھی اس کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے تیار کردہ ہائی برڈ اور جینیاتی بیجوں کی کاشت کے لیے کسانوں کو کھاد کا استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان بیجوں کو پیداوار کے لیے کھاد اور ادویات جیسے لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسان ان کمپنیوں کے بیج بازار سے خرید کر کھاد اور ادویات کی مد میں ہونے والے اخراجات کی وجہ سے قرض کے بوجھ تلے دب جاتا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے بنیادی ضروریات تک حاصل نہیں کر پاتا۔ درحقیقت یہ منافع کھاد تیار کرنے والی کمپنیاں جمع کرتی ہیں اور کسان آبادیاں قرض کے بوجھ تلے بھوک اور افلاس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں کھاد تیار کرنے والی کمپنی اینگرو کارپوریشن ہے جس نے 2013 کے پہلے چھ مہینوں میں 3.83 ارب روپے کا ریکارڈ منافع حاصل کیا۔[26] منافع میں یہ اضافہ کھاد کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ ہوا ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں ڈی اے پی کی قیمت 4,000 روپے فی بوری سے زیادہ رہی جو اس سال 4,500 سے 5,500 روپے فی بوری ہے۔

زرعی زہر کا بطور صنعت فروغ

صنعتی زراعت کے فروغ کے ساتھ ہی کیڑے مار زہر بھی ایک بڑے کاروبار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس وقت دنیا کی دس بڑی بین الاقوامی کمپنیاں بائیر، سینجنٹا، بی اے

ایس ایف، ڈاؤ ایگرو سروسز (Dow Agro Services) ، مونسانٹو، ڈوپونٹ، میکتیشم آگان (Makhteshim Agan) ، نوفان (Nufan)، سمیتو کیمیکل (Sumito Chemical)، آریسٹا لائف سائنس (Arysta Life Science) زرعی ادویات کی 89 فیصد منڈی پر قابض ہیں۔ جبکہ ان دس کمپنیوں میں سے چھ بڑی کمپنیوں کا بیج اور زرعی زہر کی عالمی منڈی کے 75 فیصد حصے پر بھی قبضہ ہے۔ ان کمپنیوں میں بائیر، سینجنٹا، بی اے ایس ایف، ڈوپونٹ، ڈاؤ ایگرو سائنس اور مونسانٹو شامل ہیں۔[27]

مختلف زرعی شعبوں پر اجارہ داری

عالمی سطح پر جرمن کمپنی بائیر زرعی ادویات میں پہلی بڑی اور بیج کی صنعت میں ساتویں بڑی کمپنی تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ کمپنی زرعی ادویات کی عالمی منڈی میں 19 فیصد کی حصہ دار ہے۔ 2007 میں اس کمپنی کی فروخت 7,458 ملین ڈالرز ریکارڈ کی گئی۔ بیج کا کاروبار کرنے والی تیسری بڑی کمپنی سینجنٹا عالمی زرعی ادویات کی منڈی کے 19 فیصد حصے پر قابض دوسری بڑی کمپنی مانی جاتی ہے۔ جبکہ جرمنی کی بی اے ایس ایف تیسری بڑی کمپنی مانی جاتی ہے جو زہریلی ادویات کی عالمی منڈی میں 11 فیصد کی حصہ دار ہے۔[28]

بیج کی صنعت اور زرعی شعبے میں کیڑے مار ادویات پر قبضے سے ان بڑی کمپنیوں کے منافع میں اضافہ ہوتا جارہا ہے 2011 کے بعد سے ان زرعی ادویات کی کمپنیوں کے منافع میں 10 فیصد اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ کمپنیاں دنیا کے خوراک کے نظام پر اجارہ داری قائم کرنے اور کسانوں کی بیج پر سے ملکیت کے خاتمے کے لیے مضبوط حکمت عملی کے ساتھ کام کررہی ہیں۔[29]

مختلف ممالک میں لاکھوں کسان ہر سال زرعی ادویات کے زہر کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ زرعی ادویات انسانی صحت کے ساتھ آب و ہوا اور ماحول کے لیے بھی نقصان کا باعث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کیڑے مار ادویات کا استعمال خودکشی کرنے کے مترادف ہے کیونکہ تقریباً ہر سال ترقی پذیر ممالک کے دیہی علاقوں کے 37,000 ہزار لوگ زرعی زہر کے استعمال سے بیماریوں کا شکار ہوکر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ ان زہریلی ادویات کے بدولت زمین میں پائے جانے والے ماحول دوست کیڑے اور جڑی بوٹیاں تباہی کا شکار ہوجاتی ہیں۔ مال مویشیوں کا ادویات سے متاثرہ خوراک لینا بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔[30]

عالمی سطح پر خوراک کی خوردہ فروش کمپنیاں

عالمی سطح پر امریکی اور برطانوی خوردہ فروش (ریٹیلر) کمپنیاں وال مارٹ (Walmart)، کیئرفور (Carrefour) اور ٹیسکو (Tesco) کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ کئی دہائیوں بعد ان دیوہیکل خوردہ فروش کمپنیوں نے صنعتی خوراک کے شعبے میں طاقتور جگہ بنالی ہے۔ ان تین بڑی کمپنیوں سے حاصل ہونے والا منافع مجموعی طور پر دس خوردہ فروش کمپنیوں کے مقابلے میں 50 فیصد زیادہ ہے۔ امریکی کمپنی وال مارٹ عالمی سطح پر خوراک کی خوردہ فروش کمپنیوں میں پہلی بڑی کمپنی شمار کی جاتی ہے۔ یہ کمپنی 379 بلین ڈالرز منافع اور دوملین سے زائد ملازمین پر مشتمل ہے۔[31] حاصل کردہ منافع کے سبب والٹن خاندان 150 ارب ڈالر کی اثاثے کا مالک ہے۔ والٹن خاندان کے مالکان میں سے ایک خاتون کی ایک سیکنڈ کی آمدنی بنگلہ دیش میں فیکٹریوں سے وابستہ ایک عورت کی پورے سال کی کمائی کے برابر ہے۔[32]

دنیا بھر کی 500 بڑی کارپوریشنوں کی سالانہ درجہ بندی کرنے والے امریکی جریدے فارچیون گلوبل 500 (Fortune Global 500) کے مطابق وال مارٹ کو بڑی عالمی تیل بنانے والی کمپنیوں کے مقابلے میں اول درجہ حاصل ہے۔[33] یہ کمپنی خوراک کے اہم جز گوشت (مرغی، مچھلی)، اجناس اور مشروبات کے علاوہ شیر خوار بچوں اور جانوروں کی خوراک تیار کرکے فروخت کرنے کا کام کرتی ہے۔ اس امریکی کمپنی کی اجارہ داری نے بہت سی خوراک کی کمپنیوں میں مقابلہ کی فضا پیدا کی جس کے نتیجے میں بہت سے کریانہ اسٹور ترتیب وار سامنے آنا شروع ہوئے۔ وال مارٹ چونکہ بہت بڑے پیمانے پر خریداری کرتی ہے اس لیے وہ ترسیل کاروں کو حکم دینے اور تیار کنندگان پر دباؤ ڈالنے کی طاقت بھی رکھتی ہے جب تک کہ وہ اس کے معیارات پر پورا نہیں اترتے۔

اس طرح کی کمپنیوں کے نقصانات ہمیں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جن میں مزدوروں کو کم اجرت فراہم کرنا، عالمی منڈیوں میں قیمتوں پر سٹے بازی، مہنگائی، مزدوروں کے قوانین کو نظر انداز کرنا اور عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور معاشرہ کو مختلف طبقات میں بانٹنا شامل ہے۔[34]

ملٹی نیشنل کمپنیوں کا وجود درحقیقت تیسری دنیا کے وسائل کو ہتھیانے اور مزدوروں کے استحصال کی وہ سازش تھی جو سولہویں صدی سے شروع ہوئی اور آج اکیسویں صدی میں اپنی جڑیں مضبوط کیے ہوئے ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں ان کمپنیوں کے دائرہ کار اور پسماندہ ملکوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کرنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ان کارپوریشن کا حجم اور عالمی منڈی میں اہم شعبہ جات پر قائم اجارہ داری کے سبب ان کے مفادات کو روکنے کے لیے تیسری دنیا کے ممالک عالمی اداروں کی پرزور کوشش کے نتیجہ میں قومی سطح پر کمپنیوں کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے پالیسی اور قانون سازی میں مصروف ہیں۔ قانونی اصلاحات کو اکثر کارپوریٹ گورننس کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کہ کمپنیوں کی طاقت بے تحاشہ ہے۔ عوامی احتجاج اور منظم مزاحمتوں نے کمپنیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ نا صرف انسان بلکہ پوری دنیا اور ماحولیات کے بچاؤ کے لیے اشد ضروری ہے کہ ان کمپنیوں کے

بنائے ہوئے کالے قوانین اور عوام دشمن سرگرمیوں منہ توڑ جواب دیا جائے۔

حوالہ جات

1. Sayeed, Azra Talat. "The Impact of General Agreement on Tariffs And Trade on the pharmaceutical sector in the third world." University of Minnesota. 1995, pp. 16, 17.
2. Korten, David, C. "When corporations rule the world." India, The Other Press. 1995, p. 249.
3. "Multinational Corporations." Accessed from https://www.boundless.com/sociology/textbooks/boundless-sociology-textbook/global-stratification-and-inequality-8/stratification-in-the-world-system-69/multinational-corporations-407-3428/
4. Encyclopaedia Britannica. "East India Company." Accessed from http://www.britannica.com/EBchecked/topic/176643/East-India-Company
5. Barnet, Richard, J. & Muller, Ronald, E. "Global reach: the power of the multinational corporations." New York, Simon And Schuster. 1974, p. 363.
6. Korten, David, C. "When corporations rule the world." 1995, p. 54.
7. Tedlow, Richard, S. "The rise of the ameican business corporation." Accessed from https://books.google.com.pk/books?id=GiCka7Lg1SwC&pg=PA64&lpg=PA64&dq=america+rise+as+a+business+corporation&source =bl&ots=ET9UbSV33E&sig=oRkSA4Psp04dWFVWwTZcOQ55nDM&hl=en&sa= X&ei=q3eaVK7NNoOyuQTz5YLACQ&ved=0CCkQ6AEwAg#v=onepage&q=america%20rise%20as%20a%20business%20corporation&f=false
8. Korten, David, C. "When corporations rule the world." 1995. p. 55.
9. Ibid. p. 59.
10. Werhane, Patricia, H. "Person, Rights and Corporations." Loyala University of Chicago, 1985.
11. Korten, David, C. "When corporations rule the world." 1995, p. 53.
12. Jed, Greer & Singh, Kavaljit." A brief history of transnational corporations." 2000. Accessed from https://www.globalpolicy.org/empire/47068-a-brief-history-of-transnational-corporations.html.
13. Petras, James & Veltmeyer, Henry. "Globalization unmasked." Madhyam Books. 2001, pp. 17, 18.
14. Barnet, Richard, J. & Muller, Ronald, E. "Global reach: the power of the multinational corporations." p. 363.
15. Korten, David, C. "When corporations rule the world." 1995, pp. 220, 221.
16. Ibid.
17. Howard, Philip, H. "Visualizing Consolidation in the Global Seed Industry: 1996-2008." 8 December, 2009.
18. ETC Group, "Who Owns Nature? Corporate Power and the Final Frontier in the Commodification of Life." November, 2008, Accessed from http://www.etcgroup.org/sites/www.etcgroup.org/files/publication/ 707/01/etc_won_report_final_color.pdf
19. Ibid.
20. Ibid.
21. The Economist," Mergers in the fertiliser industry a growth business." February 2010, Accessed from http://www.economist.com/node/15549105
22. Arovuori, Kyosti and Karikallio, Hanna, "Consumption patterns and competition in the world fertilizer markets." June. 2009. Accessed from http://www.eoq.hu/iama/conf/1035_paper.pdf
23. Ibid.
24. Ibid.
25. Eco nexus, "Agropoly: A handful of corporations control world food production." September, 2013. Accessed from http://www.econexus.info/sites/econexus/files/Agropoly_Econexus_BerneDeclaration.pdf.
26۔ حال احوال، روٹس فار ایکوٹی، 2013
27. ETC Group, "Who Owns Nature? Corporate Power and the Final Frontier in the Commodification of Life." November, 2008
28. Pesticide Action Europe, "Is the Pesticide Industry really serious about their slogan? Time to change: accepting the challenge." Accessed from http://www.pan-europe.info/Resources/Briefings/PANE%20-%202013%20-%20Is%20the%20Pesticide%20Industry%20really20serious%20about%20their%20slogan.pdf.
29. Ibid.
30. Eco nexus, "Agropoly: A handful of corporations control world food production." September, 2013. Accessed from http://www.econexus.info/sites/econexus/files/Agropoly_Econexus_BerneDeclaration.pdf.
31. ETC Group, "Who Owns Nature? Corporate Power and the Final Frontier in the Commodification of Life." November, 2008
32. Asia Pacific Women Law and Development, "The Road to Development Justice." Accessed from http://apwld.org/the-road-to-development-justice.
33. Eco nexus, "Agropoly: A handful of corporations control world food production." September, 2013.
34. Ibid.

ہری پور کے پہاڑوں میں کان کنی

تحریر: آصف خان

ضلع ہری پور خیبر پختون خواہ میں واقع ہے، جس کا کل رقبہ 1,725 مربع کلو میٹر اور آبادی تقریباً 15 لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ہری پور کی 88 فیصد آبادی دیہات میں اور 12 فیصد آبادی شہروں میں رہائش پزیر ہے۔ ضلع میں دو تحصیلیں ہیں، غازی اور ہری پور۔ محل وقوع کے اعتبار سے ہری پور کے مشرق میں ضلع ایبٹ آباد، شمال مشرق میں ضلع مانسہرہ، جنوب مشرق میں دارالحکومت اسلام آباد، مغرب میں ضلع صوابی اور شمال مغرب میں وادی سوات واقع ہے۔ پنجاب کے دو اضلاع، ضلع اٹک اور ضلع روالپنڈی کی سرحدیں ہری پور سے جنوب مغرب میں ملتی ہیں۔ پاکستان کا ساتواں بڑا انڈسٹریل اسٹیٹ حطار اور سب سے بڑا ڈیم تربیلا بھی ہری پور میں واقع ہیں۔

صوبہ خیبر پختون خواہ قدرتی طور پر معدنی دولت سے مالا مال ہے جن میں: ماربل کا پتھر، لائم اسٹون (چونے کا پتھر)، فاسفیٹ، سوپ اسٹون، جپسم، چکنی مٹی، سلیکا، کوئلہ، قدرتی گیس، خام تیل، نمک، نفلائن سائنائٹ (Nepheline Syenite) خام لوہا، کرومائیٹ، زنک، تانبا، ٹنگسٹن، فلڈسپر (Feldspar) گریفائیٹ، بیرائٹ (Barite) ڈولومائیٹ، خام سونا اور مختلف قسم کے قیمتی جواہرات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہری پوری میں پائی جانے والی معدنیات میں، سلیکا، آئرن لیٹریٹ (Iron Literate) زنک، فاسفیٹ، جپسم، لائم اسٹون، چکنی مٹی اور سلیٹ اسٹون شامل ہیں۔[1]

ہری پور کی یونین کونسل حطار میں سیمنٹ کے تین کارخانے قائم ہیں جن میں سے دو بیسٹ وے اور ایک کارخانہ دیوان سیمنٹ کا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب کے کئی سیمنٹ کے کارخانے بھی حطار کے قریب ہی واقع ہیں۔ جن میں فیکٹو، چراٹ اور عسکری سیمنٹ سمیت دیگر کارخانے شامل ہیں۔ ان کارخانوں کو سیمنٹ بنانے کے لیے جس خام مال یا معدنیات کی ضرورت ہوتی ہے ان میں لائم ااسٹون، چکنی مٹی، جپسم، سلیٹ اسٹون اور آئرن لیٹریٹ شامل ہیں۔ ان معدنیات کی کانیں ہری پور میں ہی موجود ہیں۔

اس تحریر کے لیے معلومات اکھٹی کرنے کے لیے دو مختلف گاؤں شادی اور قطبہ ڈھک کے کچھ مقامی لوگوں کے ساتھ فوکس گروپ کی شکل میں بات چیت کی گئی جس میں کان کنی کے عمل میں آبادیوں پر پڑنے والے اثرات کی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ دونوں گاؤں میں تقریباً، چھ سے آٹھ لوگوں کے گروپ سے گفتگو کی گئی۔ شادی گاؤں کے قریب لائم اسٹون اور قطبہ ڈھک کے قریب جپسم کی کانیں ہیں۔ مندرجہ ذیل معلومات ان دونوں فوکس گروپس کے ذریعے حاصل کی گئیں۔

ہری پور میں واقع کانیں: چونے کا پتھر (لائم اسٹون)

لائم اسٹون کا استعمال سیمنٹ بنانے کے عمل میں دوسرے خام مال کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے، حطار سے نزدیک ایک پہاڑ میں یہ بڑی مقدار میں موجود ہے۔ سیمنٹ کارخانوں نے یہ پہاڑ لیز پرلیا ہوا ہے جو لائم اسٹون نکالنے کے لیے کانیں خود کھودتے ہیں۔ ان کانوں میں کام کرنے والے مزدور بھی کارخانے کے ملازمین ہیں۔ مزدوروں کے مطابق لائم اسٹون کی ایک کان میں تقریباً 70 مزدور کام کرتے ہیں، جنہیں 12 ہزار سے 30 ہزار روپے تک ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ لائم اسٹون کے پہاڑ بہت سخت ہوتے ہیں اس لیے کان سے پتھر نکالنے کے لیے دھماکہ خیز مواد استعمال کیا جاتا ہے۔ اس عمل کو بلاسٹنگ یا دھماکہ کہا جاتا ہے۔

چکنی مٹی

سیمنٹ بنانے کے لیے چکنی مٹی کا بھی بہت استعمال کیا جاتا ہے جو ہری پور میں سیمنٹ کے کارخانوں کے بہت قریب ہی پائی جاتی ہے۔ مٹی اٹھانے کے مقامات ان کارخانوں کی ملکیت ہیں اور کچھ مقامات ٹھیکے پر بھی حاصل کیے گئے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی زمین ہموار کرنے کے لیے کارخانوں کو مفت میں ہی مٹی اٹھانے کی اجازت دے دیتے ہیں اور کچھ مٹی بیچتے بھی ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مٹی نکالنے کے عمل میں جب زمین کی گہرائی بڑھ جاتی ہے تو کارخانے وہ زمین چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر راستے خراب ہو جائیں یا مٹی نکالنے کے عمل میں کوئی اور دشواری پیش آنے لگے تب بھی جگہ تبدیل کرلی جاتی ہیں۔

جپسم

ہری پور میں کئی مقامات پر جپسم کی کانیں واقع ہیں جن میں کوہالہ، بریلہ، قطبہ ڈھک، جب اور تراڑ شامل ہیں۔ ان علاقوں میں واقع پانچ کانوں میں سے تین میں کانکنی جاری ہے، جن سے جپسم سیمنٹ کے کارخانوں کو بھیجا جاتا ہے۔ ٹھیکیدار مقامی لوگوں سے پہاڑ ٹھیکہ پر لے کر وہاں سے جپسم نکال کر کارخانے تک پہنچاتے ہیں جو ٹھیکیدار فی ٹن کے حساب سے فروخت کرتا ہے۔ فوکس گروپ میں شامل افراد کو اصل قیمت معلوم نہیں تھی لیکن اندازاً 1,000 سے 1,500 روپے فی ٹن کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ ایک کان سے دن میں تقریباً 30 گاڑیاں جپسم نکالا جاتا ہے اور ہر گاڑی پر

35 سے 40 ٹن جپسم چڑھایا جاتا ہے۔ کان میں کام کرنے والے مزدور اور مشین ٹھیکیدار کی اپنی ہوتی ہیں۔ جپسم کا پتھر کافی سخت ہوتا ہے اس لیے اس کو بھی لائم اسٹون کی طرح دھماکے کے ذریعے نکالا جاتا ہے۔ جپسم نکالنے کے لیے اب مشین کا استعمال بھی کیا جا رہا ہے جسے ایکس کویٹر (Excavator) کہتے ہیں۔ اس مشین سے پتھر گاڑیوں پر چڑھایا بھی جاتا ہے۔ ایکس کویٹر کے استعمال سے پہلے ایک کان میں 30 مزدور کام کرتے تھے جو کے اب فارغ ہو گئے ہیں۔

آئرن لیٹریٹ

آئرن لیٹریٹ کی کانیں خان پور اور نجف پور میں واقع ہیں جو اب زیادہ گہرائی اور مشکل راستوں کی وجہ سے بند کردی گئی ہیں۔ اب یہ پتھر ایک اور مقام حویلیاں سے حاصل کیا جا رہا ہے۔ جس کا راستہ بہتر اور زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ ان کانوں سے بھی پتھر دھماکے کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاتا تھا۔

سلیٹ اسٹون

سلیٹ اسٹون بھی سیمنٹ بنانے کے عمل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پتھر کی کانیں ہری پور میں منگ اور باندی گلو کے مقام پر واقع ہیں اور سیمنٹ کے کارخانے پتھر یہیں سے حاصل کرتے ہیں۔ باندی گلو میں سلیٹ اسٹون کی کان دیوان سیمنٹ نے خود ٹھیکہ پر لے رکھی ہے۔ پتھر توڑنے سے لے کر کارخانے تک لانے کا سارا کام کارخانہ خود سر انجام دیتا ہے۔ جن پہاڑوں میں سلیٹ اسٹون کی کانیں موجود ہیں ان میں زیادہ تر پہاڑ عوام کی ملکیت ہیں۔ ٹھیکیدار مقامی لوگوں سے پہاڑ ٹھیکہ پر لیتے ہیں جس پر مزدور اور مشینری بھی ٹھیکیدار کی ہی ہوتی ہے لیکن اب زیادہ تر کام مشین سے کیا جاتا ہے۔ حاصل کی گئی معلومات کے مطابق اس پہاڑ کو کہیں سے ایک دفعہ توڑ دیا جائے تو پھر یہ عمل آسان ہو جاتا ہے۔ پتھر خود ہی ٹوٹ کر گرتے رہتے ہیں اس لیے یہاں دھماکے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دھماکے کے اثرات

جیسا کہ پہلے بتایا گیا سیمنٹ کی تیاری میں جو خام مال استعمال ہوتا ہے اس کے حصول کے لیے پہاڑ پر کانیں بنائی جاتی ہیں اور پھر ان میں دھماکے کی مدد سے مطلوبہ پتھر توڑا جاتا ہے۔ فوکس گروپ سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق دھماکے سے علاقہ کی آب و ہوا، انسانی زندگی، زمین، پانی، جنگلات اور جنگلی حیات پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ نیچے بیان کیے جا رہے ہیں۔

انسانی زندگی پر اثرات

1۔ معاشی اثرات

جن مقامات پر دھماکہ کیا جا رہا ہے وہ آبادیوں کے بہت قریب ہیں۔ مقامی لوگوں کے مطابق یہاں بہت شدید دھماکہ کیا جاتا ہے، اکثر اوقات دھماکہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ گھر کے برتن آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ دھماکے کی تھرتھراہٹ سے مکانات میں بڑی بڑی دراڑیں پڑگئی ہیں جو کسی بھی وقت گر سکتے ہیں۔ مقامی لوگ اپنے مکانات کی تھوڑی بہت مرمت کرتے ہیں مگر یہاں دھماکے مسلسل ہوتے ہیں، بار بار مرمت کے اخراجات برداشت کرنا مشکل ہے۔

دھماکے سے پتھر اُڑ کر آتے ہیں جس کی وجہ سے مویشی نا صرف زخمی ہو جاتے ہیں بلکہ کئی مر بھی جاتے ہیں۔ کئی لوگوں نے بتایا کے ان کی گائے اور بکریاں اسی طرح سے ختم ہوگئیں۔ ان وجوہات کی بنا پر یہاں لوگوں نے جانور رکھنا کم کر دیے ہیں۔ دھماکے سے اُڑ کر آنے والے پتھروں سے یہاں زرعی زمین بھی بنجر ہو رہی ہے، مقامی لوگوں کو اس زمین پر فصل لگانے میں بہت مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ مقامی افراد کا کہنا ہے، ایک طرف تو ہماری روزی جو کھیتی باڑی اور مال مویشی سے وابسطہ تھی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے اور دوسری طرف کارخانے میں مزدور دوسرے شہروں اور علاقوں سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو کارخانوں میں روزگار نہیں دیا جاتا۔

2۔ انسانی صحت پر اثرات

پہاڑوں پر دھماکے کے لیے بارود استعمال کیا جاتا ہے۔ جن علاقوں میں دھماکہ ہو رہا ہے وہاں لوگوں نے بتایا کہ بارود کی بہت تیز بو ہوتی ہے اور گرد و غبار بھی بہت زیادہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے علاقے میں ایسی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں جو پہلے بہت کم تھیں۔ ان بیماریوں میں، الرجی، خارش، دمہ، آنکھوں کی بیماریاں شامل ہیں۔ آنکھوں کی بیماری بہت عام ہوگئی ہے جس میں تکلیف کسی بھی دوا سے کم نہیں ہوتی۔ ایک مقامی شخص نے بتایا کہ وہ خود اور اس کے بچے بھی اس بیماری سے بہت متاثر ہو رہے ہیں۔

3۔ سماجی اثرات

جب دھماکہ کیا جاتا ہے تو بہت تیز آواز اور دھمک (تھرتھراہٹ) پیدا ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شدید زلزلہ آ گیا ہو، گھر کانپ جاتے ہیں اور بچے ڈر جاتے ہیں، مکین خوف سے گھروں سے باہر نکل آتے ہیں کہ کہیں گھر ہی نہ گر جائیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ دھماکے اور پہاڑ میں ڈرل کے شور سے وہ سو بھی نہیں سکتے جس کی وجہ سے اب دیکھنے میں آ رہا ہے کے لوگ پریشان اور خستہ حال رہنے لگے ہیں اور کچھ ڈپریشن کی

شکایت بھی کرتے ہیں، جس کی ایک شکل آپس میں لڑائی جھگڑے میں اضافہ ہے۔ یہاں کان کنی سے مقامی راستے ختم ہو گئے ہیں جن پر لوگ پیدل چل کر دوسرے گاؤں خوشی، غمی میں شرکت کے لیے جایا کرتے تھے، خاص کر عورتوں کی آمد و رفت پر اس کا اثر زیادہ ہوا ہے۔

دھماکے کی وجہ سے پہاڑ کمزور ہو گئے ہیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ کسی بھی وقت یہ پہاڑ آبادی پر گر سکتے ہیں کچھ لوگ ان مسائل و خطرات سے گھبرا کر نقل مکانی پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔

زرعی زمین پر اثرات

دھماکے کی وجہ سے پتھر اُڑ کر قریب کی زرعی زمینوں میں گرتے ہیں جس کی وجہ سے زمین بے کار ہو جاتی ہے، اس زمین پر کھیتی باڑی نہیں کی جا سکتی۔ کسانوں کے مطابق وہ دھماکے سے اُڑ کر آنے والے چھوٹے پتھر تھوڑے بہت اٹھا لیتے ہیں لیکن بڑے پتھر نہیں اٹھا سکتے جس کی وجہ سے ان کی زمینیں بنجر ہو رہی ہیں۔ بارود کے استعمال اور گرد و غبار کی وجہ سے پیداوار بھی کم ہوتی ہے۔ علاقہ قطبہ ڈھک کے لوگوں نے بتایا کہ ان کے علاقے میں بہت سے قدرتی چشمے تھے جن سے وہ اپنی زمینوں کو سیراب کرتے تھے اور فصلوں کے ساتھ ساتھ مختلف سبزیاں بھی اگاتے تھے لیکن اب دھماکوں کی وجہ سے چشمے بند ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے زمینوں کو پانی نہیں ملتا، اب وہ سبزیاں نہیں اگا سکتے، صرف گندم اور مکئی اگاتے ہیں۔ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ دھماکے سے چشمے بند ہوئے ہیں۔ ویسے 2005 کے زلزلے میں کشمیر میں بھی بہت سے چشمے بند ہو گئے تھے۔ بحر حال دھماکے کی وجہ سے زیر زمین پانی کھارا (نمکین) ہو رہا ہے جو اب پینے کے قابل نہیں رہا۔

ان پہاڑوں پر جنگلی سور بھی تھے جو دھماکے کی وجہ سے میدانی علاقوں میں آ گئے ہیں، اب وہ کسانوں کے کھیت میں کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں، لوگ ان کو مار رہے ہیں، ایک دن اس قدرتی مخلوق کا خاتمہ ہو جائے گا۔

دھماکے کے علاوہ دیگر کئی وجوہات سے بھی مختلف نقصانات ہو رہے ہیں مثلاً کانوں کے مالکان نے اپنی کانوں سے قریب واقع زرعی زمین ٹھیکہ پر لے لی ہے جس پر وہ کانوں سے نکلنے والا کچرا پھینکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں مال بردار گاڑیوں کی آمد و رفت بھی بہت زیادہ ہے۔ کچرے اور بھاری گاڑیوں کی آمد و رفت سے مقامی لوگوں کی زمین تباہ ہو گئی ہے اور وہ فصل پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ لوگوں کے مطابق یہاں سے نکلنے والے جپسم میں گندھک کی آمیزش ہے جس کی وجہ سے ان کی زمینیں بنجر ہوئیں۔

کانوں کے مالکان جس زمین پر کچرا پھینکتے تھے اور گاڑیاں گزارتے تھے، اس زمین کا شروع میں کچھ معاوضہ دیا گیا جو بہت کم تھا اور اب وہ معاوضہ بھی کانوں کے مالکان کے ذمہ واجب الادا ہے جو نہیں دیا جا رہا۔ اس علاقہ کی سڑکیں اور پل بھاری گاڑیوں کے گزرنے سے خستہ حال ہو گئے ہیں، ہماری سڑکیں اور پل اس قابل نہیں تھے کہ ان گاڑیوں کا وزن برداشت کر سکیں۔

جنگلی حیات اور جنگلات پر اثرات

پہاڑوں پر موجود جنگلات میں مختلف انواع و اقسام کے جانور، چرند، پرند رہتے ہیں۔ دھماکے سے ان کی زندگی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں یا تو وہ مر جاتے ہیں یا نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ جن پہاڑوں پر سیمنٹ کے کارخانے دھماکے کر رہے ہیں ان پر بھی کئی طرح کے جاندار بستے تھے جن میں جنگلی جانور، خوبصورت پرندے، (تیتر، بٹیر اور چکور) وغیرہ مقامی لوگوں کے مطابق وہ سب ختم ہو گئے ہیں۔ اب صرف گیدڑ ہی کبھی کبھار نظر آتا ہے۔ لوگ اب اپنے پالتو جانور بھی ان پہاڑوں پہ دھماکے کے ڈر سے نہیں لے جاتے ایک وہ وقت تھا جب یہ پہاڑ قدرتی چراگاہ تھے۔

اس کے علاوہ سیمنٹ بنانے کے لیے درکار خام مال حاصل کرنے کے لیے جو کان کنی کی جا رہی ہے اس کے مقامی لوگوں، جنگلات اور جنگلی حیات پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے ہی۔ جن پہاڑوں پہ کان کنی کی جا رہی ہے ان پہ قیمتی لکڑی کے گھنے جنگل تھے جو اب تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔ مقامی لوگ ان پہاڑوں سے ضروت کی ہر قسم کی لکڑی حاصل کرتے تھے، جس سے گھروں کی تعمیر، فرنیچر اور چارپائیاں بنائی جاتی تھیں، جلانے کے لیے لکڑی اور جانوروں کا چارہ قدرت کی طرف سے غریب آبادیوں کے لیے تحفہ تھا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے لوگوں نے مویشی فروخت کرنا شروع کر دیے۔

دھماکے کے اثرات پر سائنسی معلومات

ہری پور کے علاقے حطار میں گزشتہ 30 سال سے دھماکے ہو رہے ہیں پچھلے 10 سالوں سے اس میں تین گنا اضافہ ہوا ہے۔ دھماکے کے لیے بھاری مقدار میں بارود استعمال کیا جاتا ہے۔ اس علاقے میں کبھی بھی ایسی کوئی تحقیق نہیں کی گئی جس کے ذریعہ معلوم ہو سکے کہ دھماکے سے اس علاقہ میں انسانی صحت اور ماحول پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

کینیڈا میں دھماکے اور اس میں استعمال ہونے والے دھماکہ خیز مواد امونیم نائیٹریٹ فیول آئل (ANFO) کے استعمال سے انسانوں، حیوانوں اور جنگلات پر پڑنے والے اثرات پر لکھے گئے ایک مضمون سے معلوم ہوا ہے کہ اس دھماکہ خیز مواد کے استعمال سے انسانی صحت اور ماحول پر مندرجہ ذیل اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔1

خیال کیا جاتا ہے کہ ANFO (این فو) ایک سستا دھماکہ خیز مواد ہے۔ اس

لیے کان کنی کی صنعت کار اسے پسند کرتے ہیں۔ این فو میں 90 فیصد سے زیادہ مقدار امونیم نائٹریٹ کی اور 10 فیصد اندھن (فیول آئل) کی ہوتی ہے۔ اس سے نکلنے والا مواد (امونیم نائٹریٹ) زہریلا ہوتا ہے اور پانی میں آسانی سے حل ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پانی آلودہ ہو کر زیر زمین اور کھلے پانی مثلاً جھیل، نہر، دریا سب کو آلودہ کرتا ہے۔ امونیم نائٹریٹ پانی میں رہنے والے جانداروں کی زندگی کے لیے بھی خطرہ ہے مثلاً آبی پرندے، کیچوے، مچھلیاں، جھینگے وغیرہ اس کی زد میں آسکتے ہیں۔ جہاں جہاں نائٹریٹ اور امونیا جمع ہوتا ہے وہاں آبی جانوروں کے لیے آکسیجن میں کمی واقع ہوتی ہے اور موت واقع ہوجاتی ہے۔ اگر یہ زہریلا مواد آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے پانی میں شامل ہو رہا ہے تو اس سے زمین بھی بنجر ہوجاتی ہے اور اس سے جو فصل اگتی ہے وہ بھی آلودہ ہوجاتی ہے۔

ان فو سے نکلنے والے مواد سے جنگلات کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اس مواد میں نائیٹریٹ اور امونیا کی مقدار کی زیادتی درختوں، جانوروں اور انسانوں کے لیے سخت نقصاندہ ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی ختم ہوسکتی ہے۔ ان فو سے دھماکے کے وقت بہت سی گیسز نکلتی ہیں جن میں نائیٹروجن، ہائیڈروجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، کاربن مونو آکسائیڈ، میتھین، اور نائیٹروجن ڈائی آکسائیڈ وغیرہ شامل ہیں۔

اس دھماکہ خیز مواد کے استعمال سے خارج ہونے والے امونیا سے صحت پر انتہائی مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں مثلاً آنکھ، گلے اور ناک میں جلن، سینے میں درد، سانس کی بیماری، جلدی خارش اور امونیا سے جلد کا جل جانا وغیرہ۔

این فو کے دھماکے سے خارج ہونے والی گیسز میں نائیٹروجن ڈائی آکسائیڈ، NO2، نائیٹرک آکسائیڈ NO اور کاربن مونو آکسائیڈ CO زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر دھماکے سے نکلنے والے دھویں کا رنگ، پیلا یا نارنجی ہو تو وہ تمام جانداروں کے لیے جو سانس لیتے ہیں، کی زندگی کے لیے شدید خطرے کی علامت ہے۔ اکثر اوقات دھماکے کے بعد CO کاربن مونو آکسائیڈ کی کچھ مقدار زمین میں رہ جاتی ہے جو زمین میں سفر کرتی رہتی ہے۔ جس جگہ زمین تھوڑی کمزور ہو وہاں سے نکل پڑتی ہے، اگر آبادی یا کسی گھر سے اس گیس کا اخراج ہو جائے، اس کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور ایسا ہوا بھی ہے، اس سے دم گھٹنے سے انسانی اموات ہوتی ہیں۔

فیول آئل سانس کے ذریعے جسم میں داخل ہو کر بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے جن میں سر درد، بے ہوشی، متلی، چکر آنا، غنودگی، بلڈ پریشر کا بڑھنا، بھوک میں کمی، اعصاب شل ہونا اور توجہ میں کمی جیسے مسائل شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کینسر کا خدشہ بھی ہوتا ہے مگر وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ چھوٹے بچوں خاص طور پر نومولود بچوں کو اگر امونیا سے آلودہ پانی دیا جائے تو میتھا موگلوبن (methaemo globin) کا خدشہ ہوتا ہے جس میں بچے کا رنگ نیلا دیکھائی دیتا ہے اسے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ الٹی اور پیچش بھی ہوتی ہے۔ امونیا کی آلودگی سے بوڑھے لوگوں کے ہاضمے پر بھی مضر اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ دھماکے کے بعد اکثر کچھ گیسیز فضا میں معلق رہتی ہیں ان سے بھی کئی طرح کی بیماریاں لاحق ہوسکتی ہیں۔ جن میں پھیپڑوں کی کارکردگی میں کمی، دمہ، سانس لینے میں مشکلات، پھیپھڑوں میں پانی جمع ہونا، بلغم، دل کی دھڑکن کا بڑھ جانا اور سانس لینے کی رفتار میں تیزی جیسے مسائل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس علاقہ میں تیزابی بارش بھی ہوسکتی ہے جس کی وجہ سے یہ زہریلہ مواد وسیع علاقہ میں پانی اور دوسری نباتات کو آلودہ کرسکتا ہے جو ماحولیاتی تباہی کا بڑا سبب بن سکتا ہے۔

دھماکے سے خارج ہونے والے مواد کے علاوہ سائنسی تحقیق کئی طرح کے اثرات کی بھی نشاندہی کرتی ہے جسے زمین میں تھرتھراہٹ (vibration) اور ہوا کا دباؤ جسے ایئر بلاسٹ (airblast) کا نام دیا گیا ہے، جس میں شور کے علاوہ زمین اور مکانات میں تھرتھراہٹ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دھماکہ سے اڑنے والے پتھروں سے بھی نقصانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی دھماکے کے نتیجے میں اگر پتھر دھماکے کی جگہ سے اڑ کر باہر چلا جائے تو اسے فلائی راک (flyrock) کہا جاتا ہے۔ فلائی راک کی اقسام میں (الف) فٹ بال جتنے بڑے پتھر (ب) ماربل سائز کے پتھر (ج) درختوں کے تنے اور (د) کیچڑ یا پانی شامل ہیں۔ فلائی راک انسانی جان اور دیگر جانداروں کے لیے خطرناک بتایا جاتا ہے۔ فلائی راک سے چوٹ کے علاوہ اموات بھی ہوسکتی ہیں۔ عام طور سے فلائی راک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں اور ان میں بہت طاقت ہوتی ہے۔2

تبصرہ

آج سے 15 سال پہلے ہری پور کے علاقہ حطار میں سیمنٹ کا صرف ایک کارخانہ تھا، مستحکم سیمنٹ جس کا ذکر چیلنج کے پچھلے شمارے میں تفصیل سے کیا گیا تھا۔ اُس وقت بھی کار خانے سے نکلنے والی آلودگی سے لوگ سخت پریشان تھے اور اب اس چھوٹے سے علاقے میں سیمنٹ کے تین بڑے کارخانے ہیں۔

یونین کونسل حطار میں آبادیوں کے قریب ایک پہاڑ واقع ہے جس سے یہ کارخانے سیمنٹ بنانے کے لیے لائم اسٹون حاصل کرتے ہیں۔ یہاں پر ان تمام کارخانوں کی طرف سے شدید دھماکہ کیا جاتا ہے جن سے پڑنے والے مہلک اثرات یہاں کے مکینوں نے بھی بیان کیے اور اوپر بھی دیگر سائنسی مضامین کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔

مقامی لوگوں کے فوکس گروپس سے معلوم ہوا کہ جب مستحکم سیمنٹ حکومت کے زیر انتظام تھا تو اس وقت لائم اسٹون کی کان آبادی سے کچھ دور تھی اور دھماکے کم ہوتے تھے۔ دھماکے کرنے سے پہلے لوگوں کو اطلاع دی جاتی تھی، جن لوگوں کی زمین کارخانے استعمال کرتے تھے یا جن کی زمینیں دھماکے کی وجہ سے متاثر ہوتی تھیں انہیں معاوضہ بھی دیا جاتا تھا۔ جب سے مستحکم سیمنٹ کا کارخانہ نجی مالکان نے خریدا ہے تب

سے کان بڑھتے بڑھتے آبادی کے قریب پہنچ گئی ہے۔ چونکہ اب سیمنٹ کے کارخانے پہلے سے دگنی پیداوار کر رہے ہیں اس لیے دھماکے بھی زیادہ ہوتے ہیں اور اس کے اثرات بھی شدید ہو رہے ہیں۔

جہاں ایک چھوٹے سے علاقے میں تین سیمنٹ کے کارخانے ہوں تو وہاں دھویں اور دیگر آلودگیاں کتنی زیادہ مقدار میں ہوں گی؟ یہاں کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھویں سے زندگی سخت اجیرن ہے کیونکہ سیمنٹ سب سے زیادہ آلودگی پیدا کرنے والی صنعت ہے۔ دوسری طرف قریب ہی ان کارخانوں کی کانیں بھی ہیں جہاں دن رات کان کنی کی جاتی ہے اور دھماکہ کیا جاتا ہے جس کے زندگیوں کو الگ نقصانات ہیں، جن کا اوپر مضمون میں ذکر ہو چکا ہے۔

ابھی تک کارخانوں سے ہونے والی آلودگی کو روکنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی دھماکے کے نقصانات کو کم سے کم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے اور مستقبل قریب میں بھی ایسا کوئی منصوبہ نظر نہیں آ رہا۔ ایک طرف سرمایہ دار مقامی وسائل کو لوٹ کر بے شمار دولت کما رہے ہیں اور سارا منافع بیرون ملک بھیج رہے ہیں۔ یعنی سستے خام مال، سستے مزدور سے کمایا ہوا منافع بیرون ملک جا رہا ہے۔

سائنسی تحقیق پر مبنی امیر ممالک کی حکومتیں اپنی عوام کے کئی طرح کے ضوابط قائم کرتے ہیں اور ان ضوابط پر سختی سے قائم رہنے کے لیے کئی اقدام اٹھائے جاتے ہیں۔[3,4] ہمارے ملک میں نا تو تحقیق کی جا رہی ہے اور نا ہی کسی قسم کی ضوابط تیار کیے جا رہے ہیں جو کہ صحت، ماحول اور آبادیوں کے لیے تحفظ فراہم کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہو رہا ہے کہ آزد تجارت اور منافع کے حصول کے لیے بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی سرمایہ کاروں اور ان کی دیو ہیکل کمپنیوں کو قدرتی وسائل اور مزدور دونوں کا استحصال کرنے کے لیے نت نئے ظالمانہ قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف بے تحاشا آلودگی پیدا کی جا رہی ہے جس سے زندگیوں کو خطرات میں دھکیلا جا رہا ہے۔ جس پر سب خاموش ہیں نہ حکومت کو کوئی پروا ہے نہ عوام آواز اٹھا رہی ہے۔ عوام کو شاید اندازہ نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن اوپر مضمون میں دی گئی معلومات سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ہمارا اتنا نقصان ہو جائے گا جس کا ازالہ ممکن نہیں ہو گا۔ کیونکہ جب قدرتی ماحول میں تبدیلیاں کی جاتی ہیں تو قدرتی اور کئی طرح کے بحران سامنے آنے لگتے ہیں۔ ان بحرانوں سے نمٹنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ مزدور اور کسان اپنے ساتھ ہونے والی سماجی و معاشی اور ماحولیاتی ناانصافیوں کے خلاف منظّم ہو جائیں اور ایسے دستور کی کوشش کریں کہ جو اس منافع کی دوڑ پر مبنی ترقی کا خاتمہ کرتے ہوئے ایک منصفانہ نظام قائم کرے۔

حوالہ جات:

1. Defence Research and Development Canada - Valcartier. "Assessment of ANFO on the environment: Technical Investigation 09-01." January 2010. Accessed from http://66.212.167.146/MelancthonMegaQuarry/pdfs/Assessment_ANFO_Environment-Jan-2010.pdf
http://www.cdc.gov/niosh/mining/UserFiles/works/pdfs/dotff.pdf
2. Pittsburgh, PA: U.S. Department of Health and Human Services, Public Health Service, Centers for Disease Control and Prevention, National Institute for Occupational Safety and Health, 2005 Dec accessed from http://www.cdc.gov/niosh/mining/works/coversheet1824.html
3. Mainiero, Richard J., Harris, Marcia L., and Rowland III, James H. "Dangers of toxic fumes from blasting." Accessed from http://www.cdc.gov/niosh/mining/UserFiles/works/pdfs/dotff.pdf
4. State Government Victoria, Department of Natural Resources and Environment. "Environmental guidelines: ground vibration and air blast limits for blasting in mines and quarries. Blasting Limit Guideline V 1.2." Minerals and Petroleum, Victoria 2001. Accessed from http://www.energyandresources.vic.gov.au/earth-resources/licensing-and-approvals/minerals/guidelines-and-codes-of-practice/ground-vibration-and-airblast-limits-for-blasting-in-mines-and-quarries

بقیہ حوالہ جات: وفاقی بجٹ 15-2014: ایک جائزہ

27. "IMF disbursement a tactic to pressurise govrnment." The News, 6 September, 2013, p.15.
28. "Pakistan's economic growth could be worse, warns IMF." The News, 13 September, 2013, p.1.
29. "A stabilisation budget." Dawn, 9 June, 2014, p.2.
30. "Overview of the Economy." Pakistan Economic Survey 2013-14, Government of Pakistan, p.vi.
31. Ibid, p.v-vi.
32. Government of Balochistan. "White Paper 2014-15." Finance Department, Govrnment of Balochistan, p.61.
33. Government of Punjab. The Citizens' Budget 2014-15, p.25.
34. Finance Department, Government of Khyber Pukhtunkhwa. White Paper 2014-15, p.11.
35. Syed Qaim Ali Shah Jillani, Budget Speech, pp.42,43.
36. The News, October 28, 2014, p. 12.
37. "No austerity measures: Rs 1.7 trillion deficit budget unvieled", The Express Tribune, 4 June, 2014, p.1.

اس خبر کے مطابق کارپوریٹ ٹیکس کو 33 فیصد سے 20 فیصد کی سطح تک لایا جائے گا۔

زراعت میں کسان عورتوں کا معاشی استحصال

تحریر: فائزہ شاہد

کسی بھی ملک کی ترقی کا دارومدار اس کے چار بنیادی ستونوں پر ہوتا ہے۔ معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی ستون۔ پاکستان میں زراعت کو معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک کی 70 فیصد آبادی زرعی شعبے سے وابستہ ہے جس میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے۔ زراعت کا کل ملکی پیداوار میں 26 فیصد حصہ ہے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی اس شعبے پر جاگیردار قابض رہا۔ 1960 کی دہائی کے بعد سرمایہ دار طبقے نے بھی آہستہ آہستہ اس شعبے میں قدم جمانے شروع کردیے اور 1980 کے بعد دور گلوبلائزیشن میں اس طبقے نے زراعت پر مکمل قبضے کے لیے کئی حربے استعمال کرنا شروع کردیے۔ پاکستان کا مزدور کسان آج ان دو استحصالی قوتوں کے ہاتھوں شدید کسمپرسی اور بھوک کا شکار ہے۔ ان حالات نے سارے ملک کو غربت، بدحالی ناخواندگی اور بدامنی کا شکار کردیا ہے۔

1960 کی دہائی میں سبز انقلاب کی پالیسیاں لاگو کرنے کے نتیجے میں مشینی زراعت نے کسان آبادیوں کو کھیت مزدور بننے پر مجبور کردیا ہے۔ اورسیز ڈیولپمنٹ انسٹیٹیوٹ کے مطابق پاکستان ان کچھ ایشیائی ممالک میں سے ایک ہے جہاں پچھلے دس سالوں سے زراعت سے وابستہ کسان مزدوروں کی اجرت بڑھنے کے بجائے کم ہوئی ہے۔ پاکستان میں زرعی شعبے میں دی جانے والی اجرت کسان عورتوں اور ان کے خاندان پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ملک میں 15 سال عمر تک کی 74 فیصد کام کرنے والی عورتیں زراعت سے وابستہ ہیں۔

پاکستان کی اربوں ڈالرز کی کپڑے کی صنعت کپاس چننے والی عورتوں کے کندھوں پر کھڑی ہے۔ اس کے باوجود سندھ میں کپاس چننے والی تقریباً پانچ لاکھ عورتیں شدید معاشی استحصال کا شکار ہیں جو سخت گرمی میں صبح سے شام تک کھیتوں میں چنائی کرکے زیادہ سے زیادہ 150 روپے یومیہ اجرت کما پاتی ہیں۔ کھیتوں میں استعمال کی گئی زہریلی ادویات سے عورتوں خاص کر حاملہ عورتوں کی صحت کو شدید خطرات لاحق ہوتے ہیں جنہیں اس ملک میں باضابطہ طور پر مزدور کا درجہ بھی حاصل نہیں۔

مٹر کی چنائی جو ایک محنت طلب کام ہے، جس کی اجرت 30 روپے فی گٹو دی جاتی ہے، ایک عورت ایک دن میں دو گٹو بھر پاتی ہے، جبکہ ایک گٹو میں 30 سے 35 کلو مٹر ہوتے ہیں۔ مٹر کی گوڈی بھی کی جاتی ہے۔ عورتیں صبح 8 بجے سے دوپہر 2 بجے تک کام کرتی ہیں جس کی انہیں صرف 150 روپے اجرت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں اس عمل کے دوران حاصل ہونے والی گھاس اپنے جانوروں کے لیے چارے کے طور پر ساتھ لے جاتی ہیں۔ یہاں توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ ان عورتوں کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنے مویشیوں کے لیے چارہ خرید سکیں۔

اسی طرح آلو کی چنائی کرنے والی عورتیں بھی معاشی استحصال کا شکار ہیں، جنہیں صرف 25 روپے فی بوری اجرت دی جاتی ہے۔ ایک بوری میں 40 سے 50 کلو آلو ہوتے ہیں۔ ایک عورت دن میں تین سے چار بوری آلو بھر پاتی ہے۔ یہی بوری منڈی میں تقریباً 1,000 روپے کی فروخت ہوتی ہے۔ معاشی بدحالی کی وجہ سے کسان عورتیں کھیتوں میں زمیندار کی من مانی اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔

پاکستان میں کارپوریٹ زراعت کو فروغ سے غذائی فصلوں کے بجائے نقدآور فصلوں کے فروغ نے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو غذائی عدم تحفظ سے دو چار کردیا ہے، جس کی ایک مثال اسٹرابری کی کاشت ہے، جو پچھلے چند سالوں سے ملتان میں کاشت کی جارہی ہے۔ اس سے پہلے اس علاقے میں گندم کاشت کی جاتی تھی جس سے یہاں کے کھیت مزدوروں کو ایک ایکڑ گندم کی کٹائی کے بدلے دو من گندم اجرت کے طور پر مل جاتی تھی۔ جس کا خاندان بڑا ہوتا تھا اسے زیادہ گندم حاصل ہوتی تھی جس سے وہ چند مہینے اپنے بچوں کا پیٹ باآسانی بھر پاتے تھے۔ اب اسٹرابری کاشت ہونے کی وجہ سے انہیں گندم خریدنی پڑتی ہے اور ان کے معاشی حالات مزید خراب ہورہے ہیں۔ اسٹرابری کے کھیت میں کام کے لیے عورتوں کو 100 روپے یومیہ اجرت ملتی ہے۔ اس قلیل اجرت کے بدلے ان عورتوں کو صبح 8 سے شام 4 بجے تک کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر اسٹرابری کو ٹوکروں میں پیک کرنا ہو تو رات گئے تک ان عورتوں کو کام کرنا پڑتا ہے جس کے انہیں اضافی 50 روپے دیے جاتے ہیں۔ اسٹرابری کے اس ایک ٹوکرے کی قیمت 1,000 سے 1,400 روپے تک ہوتی ہے۔ اس اجرت میں ایک وقت کا کھانا بھی بمشکل حاصل ہوسکتا ہے۔ کسی وجہ سے عورتیں کام پر نہ جاسکیں تو دہاڑی سے محرومی انہیں قرض کے بوجھ تلے دبا دیتی ہے۔ اسٹرابری کے کھیتوں میں کیمیائی کھاد ڈالنے کے بعد پانی لگایا جاتا ہے جس سے ان عورتوں کے ہاتھوں کی کھال اتر جاتی ہے۔ اس نقدآور فصل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ عورتیں جو ایک سال میں گندم کے کھیت میں مزدوری کرکے 6 سے 8 من گندم حاصل کرلیا کرتی تھیں اس خوراک سے محروم ہوگئیں۔

غرض یہ کہ زرعی شعبے سے وابستہ یہ عورتیں ہر قسم کی مزدوری میں معاشی استحصال کا شکار ہیں۔ ان سارے مسائل کی جڑ ملک پر مسلط جاگیردارانہ نظام ہے جو نا صرف ذرائع پیداوار پر قابض ہے بلکہ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان مزدوروں کو ان کی محنت کی اصل اجرت تک نہیں دیتا۔ اگر ان چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے پاس اپنی زمین ہوتی تو وہ یوں کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور نہ ہوتے اور معاشی طور پر مستحکم بھی ہوتے۔

بات تو سچ ہے مگر

سندھ ہائیکورٹ نے 16,800 ایکڑ جنگلات کی زمین بااثر لوگوں کو لیز پر دینے کا حکم معطل کردیا

سندھ ہائیکورٹ نے ٹھٹھہ، بدین، سجاول اور دادو اضلاع میں تجارتی بنیادوں پر فارمنگ کے لیے صوبائی حکام کی طرف سے 16,800 ایکڑ جنگلات کی زمین، کی لیز کے لیے جاری کیے گئے انتظامی حکم کو اگلے عدالتی حکم تک معطل کردیا۔ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے ممبر قومی اسمبلی سید اعجاز شاہ شیرازی کی طرف سے جنگلات کی زمین کی غیر قانونی الاٹمنٹ کے خلاف دائر کی گئی درخواست میں کہا گیا ہے کہ 14 مئی کو وزیر اعلی سندھ نے محکمہ جنگلات کی ''ایگرو فاریسٹری لیز پالیسی'' کے تحت محکمہ رونیو سندھ کی جانب سے 16,800 ایکڑ جنگلات کی زمین کی لیز کے لیے بھیجی گئی سمری کی منظوری دی تھی۔ جس کے نتیجے میں 30 مئی کو چیف کنزرویٹر نے سندھ ایگرو فوریسٹری پالیسی 2004 کے تحت موثر طریقے سے جنگلات کے تحفظ کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لیز کا نوٹیفکشن جاری کیا تھا۔ درخواست گزار کے مطابق بااثر لوگوں کو زراعت اور ماہی پروری کے لیے قیمتی زمینیں الاٹ کرنے کے لیے جنگلات کو صاف کیا جا رہا ہے۔ حکومت کا یہ قدم مقامی غریب لوگوں سے ان کا روزگار چھین کر نقل مکانی پر مجبور کردے گا اور اس غلط فیصلے سے یقینی طور پر سندھ کے قیمتی جنگلات کم ہوجائیں گے۔ عدالتی بنچ نے جسٹس محمد علی مظہر کی سربراہی میں سیکرٹری محکمہ جنگلات سندھ، چیف کنزرویٹر، ڈویژنل افسر جنگلات اور ایس ایس پی بدین کو نوٹس جاری کرتے ہوئے ہدایت کی کہ 19 اگست کو اپنا جواب داخل کریں اور لیز سے متعلق نوٹیفکشن کو اگلے حکم تک معطل کردیا۔

(دی نیوز، 24 جولائی 2014، صفحہ 20)

ملتان میں کھاد فیکٹریوں سے ہونے والی ماحولیاتی آلودگی کے خلاف مظاہرہ

ملتان میں تقریباً دو ہزار شہریوں نے چار گھنٹے تک ملتان سے بھاولپور جانے والی مرکزی شاہراہ بند کرکے ماحولیاتی آلودگی کے خلاف مظاہرہ کیا اور علاقے کی دس کھاد فیکٹریوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ مظاہرین نے کھاد فیکٹری کا گیٹ توڑ دیا اور اپنے مطالبات کی منظوری اور فیکٹری کو تالا لگنے تک احتجاج جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ مظاہرین کے مطابق ملتان کے گرد و نواح میں قائم کھاد فیکٹریاں ماحول آلودہ کررہی ہیں جس سے قریبی علاقوں کے تقریباً دس لاکھ افراد مختلف امراض کا شکار ہوگئے ہیں۔ ضلعی اور صوبائی حکومت نے فیکٹریوں سے نکلنے والے دھویں اور کیمیائی فضلے کی نگرانی کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ مظاہرین نے کھاد فیکٹریوں اور صوبائی حکومت کے خلاف نعرے بھی لگائے۔ بستی ملوک کے رہائشی احمد علی نے نمائندے کو بتایا کہ وہ پھیپڑوں کے مرض میں مبتلا ہے اور کم از کم ایک سو مزید ایسے افراد کو جانتا ہے جو ایسے ہی مرض میں مبتلا ہیں۔ ان بیماریوں کی وجہ پچھلے دس سالوں سے کھاد فیکٹریوں کی وجہ سے ہونے والی آلودگی ہے۔ بستی ملوک جو بڑی دیہی آبادی ہے، سمیت متعدد بستیوں کے مکینوں کا کہنا ہے کہ فیکٹریوں سے نکلنے والا کیمیائی فضلہ خاص طور پر ''سلفر'' زرعی زمینوں کو متاثر کررہا ہے۔ تقریباً 200 ایکڑ زمین فیکٹری سے نکلنے والی آلودگی سے برباد ہوگئی ہے اور تقریباً 15 مربع کلومیٹر کا علاقہ 10 کھاد فیکٹریوں سے ہونے والی آلودگی سے براہ راست متاثر ہوا ہے۔ ضلعی انتظامیہ اور پولیس کی جانب سے دفعہ 144 کے تحت فیکٹری پر تالا لگنے کے بعد مظاہرین نے احتجاج ختم کردیا۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 5 جولائی 2014، صفحہ 5)

اوکاڑہ میں زمینوں پر پھر سے پرتشدد کاروائی

3 جولائی، 2014 کو فوج نے چک 15/4L پنجاب ٹاؤن اوکاڑہ میں حملہ کرکے ایک گھنٹے تک محاصرہ کیا جس کے نتیجے میں دو کسان نور محمد کمبوہ اور محمد حسن جان بحق ہوگئے۔ درجنوں کسان زخمی ہوئے اور گھر گھر تلاشی کے دوران 65 کسانوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ فوجی آپریشن کسانوں کی جانب سے نہر کو احتجاجاً بند کرنے پر شروع ہوا۔ کسان کینٹ انتظامیہ کی جانب سے ٹھیکے کی رقم 17,000 سے 22,000 فی ایکڑ کرنے اور اس اضافے کو تسلیم نہ کرنے پر زمین سے بے دخل کرنے کے ظالمانہ فیصلے کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔ مقامی رہائشی محمد اشفاق کے مطابق مسلح فوجی ٹرکوں میں آئے جیسے وہ دشمن سے لڑنے یا کشمیر فتح کرنے آئے ہوں۔ 2000 سے اوکاڑہ میں کسانوں کے حقوق کے لیے لڑنے والی تنظیم انجمن مزارعین پنجاب کے ترجمان نور نبی نے دو افراد کی ہلاکت اور کئی لوگوں کے زخمی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ یہ سب ہم نے نہیں کیا نہ ہی ہمارے پاس ہتھیار تھے نہ ہی ہماری طرف سے گولی چلائی گئی۔ مقامی لوگوں اور صحافیوں کے مطابق ڈسٹرکٹ پولیس افسر (ڈی پی او) بابر بخت قریشی پچھلے ایک ہفتے سے جب سے فارم انتظامیہ نے ٹھیکے میں اضافہ کیا ہے معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہے تھے لیکن فوج نے 2 جولائی کو 5 افراد کو حراست میں لے لیا جنہیں بعد میں ڈی پی او کی مداخلت پر رہا کیا گیا۔ مقامی صحافی کے مطابق

کسان ڈی پی او کی کوششوں سے ٹھیکے کی رقم فی ایکڑ 19,000 تک بڑھانے پر رضا مند ہوگئے تھے۔ بظاہر لگتا ہے کہ فوجی انتظامیہ کے لیے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ 20 سالہ محمد حسن کے والد کے مطابق، حسن کو پیچھے سے اس وقت گولی لگی جب وہ فائرنگ سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ حسن بھی وہیں جانحق ہوا جہاں نور محمد کمبوہ کو مارا گیا تھا۔ ان کے مطابق ''فوج جاتے ہوئے ان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ جب ہم نے لاشیں وصول کرنے کے لیے فوج سے رابطہ کیا تو ہم سے تحریری ضمانت طلب کی گئی کہ ہم کوئی قانونی کاروائی نہیں کریں گے''۔ گاؤں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ فوج کسانوں کو پکڑنے کے لیے زبردستی گھروں میں داخل ہوئی۔ انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ ان کے راستے میں کون ہے۔ جانحق ہونے والے نور کمبوہ کی بیٹی نے اپنے زخم دکھاتے ہوئے کہا کہ ''فوجیوں نے ہمیں رائفل کے بٹوں سے مارا''۔ وہاں کچھ اور عورتیں بھی تھیں جن کے سروں پر اور دیگر اعضاء پر پٹی بندھی تھی، کچھ مرد گولی کے زخم بھی دکھا رہے تھے۔ کسانوں نے بتایا کہ فوج نے گھروں میں گھسنے کے لیے دروازے، کھڑکیاں توڑ دیں۔ گاؤں میں جگہ جگہ پڑے گولیوں کے خول اور دیواروں پر گولیوں کے نشانات دیکھے جاسکتے ہیں۔ محمد صدیق جن کی زمین کا ٹھیکہ ختم کردیا گیا ہے کا کہنا تھا کہ ''کیا ہمارے کوئی حقوق نہیں ہیں؟ اگر فوج سمجھتی ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگوں نے پانی بند کیا ہے تو ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نہر تو پہلے ہی خشک ہے۔ وہ پولیس کے پاس جاسکتے تھے اور انہیں تفتیش کرنے دیتے۔ وہ کیسے 1,100 فوجی ہم پر فائرنگ کرکے مارنے کے لیے بھیج سکتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ ہم غریب اور کمزور ہیں اور یہ لوگ ہمارے ساتھ سب کچھ کرسکتے ہیں''۔ واقعے پر بات کرنے کے لیے ڈی پی او اور ایس ایچ او اپنے دفتر میں موجود نہیں تھے، بتایا گیا کہ دونوں افسران ملٹری کمانڈر کے ساتھ میٹنگ میں ہیں۔ واقعے پر درج کی گئی ایف آئی آر کے مطابق ڈنڈے، لاٹھیوں اور آتشیں اسلحے سے لیس 100 سے 125 مسلح افراد نے گاؤں کے قریب فوج کی گشتی ٹیم پر حملہ کیا جس پر ریپڈ رسپانس فورس طلب کی گئی۔ اس دوران حملہ آوروں نے گشتی ٹیم پر فائرنگ کی جس کے نتیجے میں ایک حوالدار اور دو سپاہی زخمی ہوگئے جس کے بعد مزید نفری طلب کی گئی اور گشتی ٹیم نے خود کو بچانے کے لیے جوابی کاروائی کی جس کے نتیجے میں محمد حسن، جس نے فوج پر کلاشنکوف سے حملہ کیا تھا گولی لگنے سے موقع پر جانحق ہوگیا جبکہ نور محمد کمبوہ حملہ آوروں کی گولی سے جانحق ہوا۔ انجمن مزارعین پنجاب کے ترجمان نور نبی کے مطابق فوج کی طرف سے متعدد نامعلوم کسانوں اور انجمن کے آٹھ رہنماؤں کے خلاف مقدمے کا اندراج قانون کے ساتھ مزاق ہے۔ فوج دونوں مرنے والوں کی لاشیں واپس نہیں کررہی ہے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کو ساتھ لے جا کر شواہد کو دبانے کی کوشش کررہی ہے جس میں پولیس ان کی مدد کررہی ہے۔

(ڈان، 6 جولائی 2014، صفحہ 16)

خیبر پختون خواہ میں جینیاتی بیج متعارف

پاکستان تحریک انصاف کی حکومت نے خیبر پختون خواہ کی صوبائی اسمبلی میں گزشتہ ماہ 24 اپریل، 2014 کو جینیاتی بیج کا بل پیش کرکے صوبہ کی عوام کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جینیاتی بیج پر یورپی یونین کے رکن ممالک کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے ممالک بشمول بھارت میں بھی پابندی عائد ہے۔ خوش قسمتی سے ان ممالک کے رہنما اس بیج کے نقصانات سے بخوبی آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ نباتات اور حیوانات کو تباہ کر سکتے ہیں۔ یہ بیج ''ڈیتھ سیڈ'' (موت لانے والا بیج) یا ''ٹرمینیٹر جی۔ایم سیڈ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس بیج کو اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ اس سے صرف ایک دفعہ پیداوار حاصل ہوتی ہے اور یہ اگلی فصل کے لیے بیج نہیں دیتا ہے تاکہ اسے ملٹی نیشنل کمپنیاں ہر سال فروخت کرکے زیادہ سے زیادہ منافع کماسکیں۔ اس کے علاوہ اس بیج کے لیے صرف امریکی تیار کردہ زرعی ادویات ہی موزوں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی قانون سازی سے ظاہر ہوتا ہے کہ پی ٹی آئی کے رہنما صوبے کو ایک ناکام تجربے کے لیے تجربہ گاہ بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ ہے کہ پاکستان میں کم لاگت اور بے ضرر بیج ہوتے ہوئے بھی اس صوبے کے قانون دان ایسے منصوبہ پر غور کررہے ہیں۔ عموماً کسی بھی قانون سازی سے پہلے اسمبلیوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس قانون کے فوائد، نقصانات اور ٹیکنالوجی کے بارے میں معلومات اور اس کے استعمال سے بخوبی آگاہ کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پی ٹی آئی کے قانون سازوں میں ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون 9 مئی، 2014، صفحہ 7)

سوئیڈن کی زراعت میں مشترکہ منصوبہ بندی میں اظہار دلچسپی

سوئیڈن کے تجارتی اور کاروباری وفد کی وزیر برائے قومی غذائی تحفظ و تحقیق سکندر حیات بوسن سے ملاقات کے موقع پر سوئیڈن کے وزیر تجارت کے معاون خصوصی جونس ہیف سٹرم (Jonas Hafstrom) نے پاکستان کے ساتھ زرعی شعبے میں تجارت کو بڑھانے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں زراعت کے مختلف شعبوں میں مشترکہ تجارت شروع کرنے اور اسے بڑھانے کے بہتر مواقع موجود ہیں۔ دونوں ممالک نے زرعی شعبے میں باہمی تعاون بڑھانے کے لیے لائحہ عمل طے کرنے پر اتفاق کیا اور زراعت کے مختلف شعبوں اور زرعی تحقیق میں دوطرفہ تعاون بڑھانے پر زور دیا۔ دونوں ممالک نے پائیدار بنیادوں پر زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے تجربات کے باہمی تبادلے کا عزم بھی کیا۔ سکندر بوسن نے اس بات پہ زور دے کر کہا کہ پاکستان اور سوئیڈن کے پاس دوطرفہ تجارت، خصوصا زرعی شعبے اور زرعی تحقیق بڑھانے کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ وفاقی وزیر نے سوئیڈن کے سرمایہ کاروں کو پاکستانی سرمایہ کاروں کے ساتھ مل کے

زراعت کے شعبے میں منصوبہ بندی کے ساتھ سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان سرمایہ کاروں کے لیے ایک پرکشش مقام ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 20 مئی 2014، صفحہ 11)

دیامر بھاشا ڈیم کے لیے زمین کا حصول

وزیراعظم نے متعلقہ حکام کو دیامر بھاشا ڈیم کے لیے زمین کے حصول کے عمل کو اگست 2014 تک مکمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چیئرمین واپڈا ظفر محمود کے مطابق اس مقصد کے لیے درکار رقم کا تعین اینول پلان کوآرڈینشن کمیٹی (APCC) کے اگلے اجلاس میں کیا جائے گا۔ وزارت خزانہ اور پلاننگ کمیشن کے ذرائع کا کہنا ہے کہ APCC کی جانب سے اس منصوبے کے لیے وفاقی ترقیاتی بجٹ 15-2014 میں 525 ارب روپے مختص کرنے کی سفارش کیے جانے کا امکان ہے جسے نیشنل اکنامک کونسل سے منظوری حاصل کرنی ہوگی۔ اس منصوبے کے لیے سب سے پہلے ورلڈ بینک، ایشین ڈیولپمنٹ بینک اور دیگر عالمی اداروں سے سرمایہ بطور قرض حاصل کیا جائے گا۔ ایک سوال کے جواب میں چیئرمین واپڈا نے کہا کہ ایشین ڈیولپمنٹ بینک نے قرض دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بینک کا کہنا ہے کہ منصوبہ بہت بڑا ہے جس کے لیے بڑے پیمانے پر سرمایہ درکار ہے جسے بینک انفرادی طور پر فراہم نہیں کر سکتا، اگر دیگر اہم بینک بھی قرض دینے میں حصہ لیں تو ایشین ڈیولپمنٹ بینک بھی رقم دینے کے لیے تیار ہے۔ حکومت پر امید ہے کہ وہ کلیدی عالمی مالیاتی اداروں کو اس اہم منصوبے کے لیے قرض دینے پر آمادہ کرلے گی۔ واپڈا حکام کے مطابق ڈیم کا تفصیلی نقشہ مارچ 2008 میں مکمل کرلیا گیا تھا۔ اگست 2012 میں قرض فراہم کرنے والے بڑے اداروں کے پیچھے ہٹ جانے سے منصوبے کو دھچکا لگا ہے۔ ورلڈ بینک اور ایشین ڈیولپمنٹ بینک دونوں نے ڈیم متنازع علاقے میں بنائے جانے پر منصوبے کے لیے سرمایہ فراہم کرنے سے انکار کردیا تھا۔ بینکوں کا کہنا ہے کہ پاکستان منصوبے کے لیے پڑوسی ملک بھارت سے (این او سی) حاصل کرے۔ لیکن 20 اگست، 2013 کو وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے دعویٰ کیا کہ ورلڈ بینک نے این او سی کے بغیر دیامر بھاشا ڈیم کے لیے رقم فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے اور انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایشین ڈیولپمنٹ بینک اس منصوبے کے مالی انتظامات کی قیادت کرے گا۔ 27 اگست، 2013 کو اسحاق ڈار نے کہا کہ داسو ڈیم اور دیامر بھاشا ڈیم ساتھ ہی شروع ہونگے جن کی تکمیل میں 10 سے 12 سال لگیں گے۔ وزیراعظم کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں 4,500 میگاواٹ کے دیامر بھاشا ڈیم، 2,160 میگا واٹ کے داسو پن بجلی منصوبے، 57 کلومیٹر طویل فیصل آباد سے خانیوال (M.4) موٹروے اور راولپنڈی اسلام آباد میٹرو بس سروس منصوبوں کے لیے بھی رقم کی منظوری دے دی۔

(دی نیوز، 24 مئی 2014، صفحہ 15)

امریکی حکام کی پاکستان سے زندہ جانوروں کی درآمد پر پابندی ہٹانے کی درخواست

امریکی ڈپٹی سیکرٹری ولیم جے برنز نے وزیرخزانہ اسحاق ڈار سے ملاقات میں پاکستان کو امریکہ سے زندہ جانوروں کی درآمد پر سے پابندی اٹھانے کی درخواست کی ہے۔ وزارت خزانہ کی طرف سے جاری کی گئی معلومات کے مطابق ڈپٹی سیکرٹری نے امید ظاہر کی ہے کہ پاکستانی حکومت امریکہ سے جانوروں کی درآمد کی اجازت دیدے گی۔ پاکستان نے بووائن سپونجی فورم این سافیلوپیتھی (Bovine Spongiform Encephalopathy) کے خطرے کے پیش نظر 2001 میں زندہ جانوروں کی درآمد پر پابندی عائد کردی تھی۔ اس بیماری کو عام طور پر میڈ کاؤ ڈیزیز (Mads Cow Disease) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسحاق ڈار نے امریکی ڈپٹی سیکرٹری کو یقین دلایا ہے کہ کابینہ کی اقتصادی رابطہ کمیٹی اس حوالے سے موزوں فیصلہ کرے گی، جبکہ وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق نے کمیٹی کو امریکہ سے زندہ جانوروں کی درآمد پر پابندی ہٹانے کے لیے پہلے ہی سمری بھیج دی ہے۔ سرکاری حکام کے مطابق ان جانوروں کی درآمد کی اجازت دی جائے گی جن میں پچھلے گیارہ سالوں میں اس بیماری کے اثرات نہیں پائے گئے، جس کی تصدیق جانور برآمد کرنے والے ممالک کے متعلقہ حکام کریں گے۔ وزارت خوراک کی طرف سے بھیجی گئی سمری پر ذرائع ابلاغ کے مطابق زندہ جانوروں میں بیماری کی تشخیص مشکل ہے کیونکہ پاکستان میں اس کی سہولت موجود نہیں ہے۔ ذبح کے بعد دماغی خلیوں اور دیگر اہم حصوں جیسے ریڑھ کی ہڈی سے طبی معائنے کے ذریعے تشخیص ہو جاتی ہے۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 10 مئی 2014، صفحہ 11)

تھر میں خشک سالی کی وجہ سے بڑے پیمانے پر نقل مکانی اور حکومت کی بے حسی

حالیہ دنوں میں تھرپارکر میں خشک سالی کی وجہ سے بچوں کی اموات کے حوالے سے خبروں میں زیر گردش ہے۔ سپرنٹنڈنٹ دیہی مرکز صحت چھاچھرو کی طرف سے دیئے گئے اعداد و شمار کے مطابق مارچ تک مرنے والوں کی تعداد سات ہے جن میں زیادہ تر بچے تھے لیکن غیر سرکاری اداروں کا کہنا ہے کہ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ چاچھرو میں ایک غیر سرکاری تنظیم کے سماجی کارکن علی نواز کا کہنا ہے کہ صرف سرکاری ہسپتالوں میں واقع اموات کو شمار کیا جارہا ہے۔ بنیادی صحت کے مراکز اور ڈسپنسریوں میں مرنے والے بچوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق مارچ سے اب تک 112 اموات ہوئی ہیں۔ میڈکل سپرنٹنڈنٹ کا کہنا ہے کہ ''غذائی کمی اور خشک سالی میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب این جی اوز اور

چھوٹے موٹے اخبارات کے لیے کمائی کا ایک ذریعہ ہے"۔ سپرنٹنڈنٹ کے مطابق اس سال مارچ تک ہمارے ہسپتال میں صرف ایک ہلاکت ہوئی، باقی مہینوں کی تفصیلات جمع کی جارہی ہیں۔ تھر میں ہونے والے اموات کی وجہ وہاں کے مسائل ہیں جن کا لوگ سامنا کررہے ہیں، جن میں ایک سے زیادہ بچوں کو جنم دینا، بچوں کی قبل از وقت پیدائش اور مقامی لوگوں کے پاس مناسب خوراک کا نہ ہونا شامل ہے، جس کے نتیجے میں بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ یہاں صرف غذائی کمی موت کی وجہ نہیں۔ تھر دیپ کے سینئر پروگرام منیجر ڈاکٹر اشوک بکھتانی کے مطابق بارشوں کے حوالے سے یہ بدترین سال ہے۔ تھر اب مکمل خشک ہوچکا ہے۔ اب اگر بارش ہو بھی جائے تو سوکھی فصلوں اور مویشوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اس خشک سالی نے مجھے 1987 میں آنے والی خشک سالی کی یاد دلا دی جسے "کالا ڈکر" یعنی کالی خشک سالی کہا جاتا تھا، یہ بالکل وہی صورت حال ہے۔ ہر طرف غذائی کمی ہے، جانور مر رہے ہیں اور لوگ نقل مکانی کررہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ حکومت اس معاملے کو ایک الگ نظر سے دیکھتی ہے۔ ڈاکٹر اشوک کہتے ہیں کہ تھر میں خاص کر چھاچھرو میں ہنگامی بنیادوں پر طویل مدتی منصوبے شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ بارشیں نہیں ہونگی تو فصل نہیں اگے گی، فصل نہیں ملے تو ایک خاندان جو مالی طور پر مال مویشیوں پر انحصار کرتا ہے انہیں کس طرح چارہ کھلائے گا، یہاں تک کہ خشک سالی میں بچ جانے والے جانور اب کسی کام کے نہیں کیونکہ وہ افزائش نسل نہیں کرسکیں گے اور بلاآخر مر جائیں گے۔ صورتحال پہلے سے مزید خراب ہے حالانکہ حقائق پہلے سے ہی واضح تھے۔ اس سال چھاچھرو کی تمام 17 یونین کونسلوں میں بارش نہیں ہوئی آنے والے دنوں میں زمین اور لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوسکتا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم تبدیلی کے لیے ہاری یا کسان کی بات سنیں۔ اس سال تھر میں 31 افراد نے غذائی کمی اور مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے خودکشی کی ہے۔

(ڈان، 31 اگست 2014، صفحہ 16)

وفاق نے صوبوں سے بیج کا اختیار واپس لے لیا

حکومت نے بیج سے متعلق تمام معاملات وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار میں رکھنے کے لیے قومی اسمبلی میں ایک بار پھر بیج کے حوالے سے ترمیمی بل پیش کردیا ہے جو دراصل چار سال پہلے پیش کیا گیا تھا جس پر کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ یہ بل سیڈ ترمیمی بل 2014 (Seed Amendment Bill 2014) کے نام سے 8 اگست 2014 کو وزیر برائے قومی غذائی تحفظ و تحقیق سکندر حیات خان بوسن نے پیش کیا۔ ترمیمی بل کا مقصد 1976 کے سیڈ ایکٹ میں ترامیم کے ذریعہ بیج کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے نجی شعبے کے کردار کو بڑھانا ہے، نجی شعبہ جو پہلے ہی بیج کی صنعت میں مضبوط اور متحرک کردار ادا کررہا ہے۔ اٹھارویں آئینی ترمیم کے بعد زراعت کے ساتھ ساتھ بیج کے حوالے سے تمام اختیارات صوبوں کو منتقل ہوگئے تھے۔ اس تناظر میں صوبہ پنجاب اور کے پی کے کی صوبائی اسمبلیوں میں پہلے ہی بل پیش کردیا گیا ہے لیکن وفاقی وزیر نے دعوی کیا ہے کہ تمام صوبوں نے ایک خصوصی قرارداد کے تحت 1976 کے بیج کے قانون میں ترامیم کا اختیار وفاق کو سونپ دیا ہے اور آئندہ یہ اختیار وفاق کے پاس ہی رہے گا۔ بیج کے کاروبار اور اس سے متعلق تمام معاملات کی مرکز کو منتقلی انتہائی اہمیت کی حامل ہے جس نے صوبائی خودمختاری کی کوششیں ناکام بنادی ہے۔ وفاقی سطح پر زراعت، خوراک اور مال مویشی کی وزارت کو ختم کرکے وزارت برائے قومی غذائی تحفظ و تحقیق کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس نئی وزارت کے قیام سے صوبوں کے بعض زرعی معاملات اور اس سے جڑے دیگر محکموں کی فیصلہ سازی متاثر ہوئی ہے۔ مجوزہ بل کی منظوری کے بعد نجی اداروں کو بنیادی بیج پیدا کرنے، اسے بڑھانے اور تصدیق کی اجازت ہوگی۔ بیج کی تصدیق کے لیے کمپنیوں کو لیبارٹری کے قیام کی بھی اجازت ہوگی۔ وفاقی وزیر کے مطابق اب تک یہ کام حکومتی اداروں کے تحت ہو رہے تھے مگر وقت کے ساتھ عوامی شعبے کی یہ صلاحیت معطل ہوگئی تھی۔ انھوں نے یقین دلایا کہ حکومت سرکاری اور نجی ادارے دونوں کو اس صنعت میں کردار ادا کرنے کے یکساں مواقع فراہم کرے گی۔ بظاہر لگتا ہے کہ حکومت بین الاقوامی دباؤ پر ملکی بیج کی صنعت میں جدت کے نام پر ملٹی نیشنل بیج کمپنیوں کے لیے پاکستانی بیج کی منڈی کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں صوبوں سے علیحدہ علیحدہ معاملات طے کرنے سے گریزاں ہوں اور صرف وفاقی حکومت سے تعلقات کو ترجیح دیں۔ بیج کا ترمیمی بل اور پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ ڈبلیو ٹی او معاہدے کے تحت ملکی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے 2010 میں قومی اسمبلی میں پیش کیے گئے تھے۔ حکومت اور افسر شاہی نے جاگیرداروں کی ایما پر چار سال تک اس بل کے خلاف مزاحمت کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر یہ بل پاس ہوکر نافذ ہوگیا تو یہ عمل ملک میں صنعتی زراعت کا موجب ہوگا اور موجودہ زرعی نظام پر ان کی گرفت کمزور کردے گا جس سے وہ منافع کماتے ہیں۔ ترمیمی بل میں کہا گیا ہے کہ زراعت کے پرانے طریقے آج کی جدید ضروریات اور مستحکم زرعی پیداوار سے مطابقت نہیں رکھتے۔ تاہم اس قانون سے نقصان پسے ہوئے اور چھوٹے کسانوں کو ہوگا کیونکہ تجارتی بیج کا نظام کسانوں کے روایتی بیج کے نظام کی اہمیت کو کم کردے گا۔ کے پی کے، کے پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ 2014 کے مسودے میں اس خدشے کے امکانات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اس ایکٹ میں کہا گیا کہ بیج پر کسانوں کا روایتی حق، بیج کو محفوظ کرنے، استعمال کرنے، تبادلہ کرنے، تقسیم کرنے اور اپنی محفوظ اقسام کی فصلوں کو فروخت کرنے کے حق کو متاثر نہیں کرتا سوائے اس کے کہ کمپنیوں کے رجسٹرڈ (پیٹنٹ شدہ) بیج کو دوبارہ اگانے کے لیے فروخت کیا جائے۔

2013 میں امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ پاکستان نے زرعی انٹولیکچل پراپرٹی رائٹس (IPR's) کی حفاظت کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات نہیں کیے۔ پاکستان جینیاتی مواد پر بھی IPR's لاگو نہیں کرتا جو امریکی بیج

کمپنیوں کے لیے پاکستانی منڈی میں داخل ہونے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا یہ بیان پلانٹ بریڈرز رائٹس اور سیڈ بل 2010 کے حوالے سے دیا گیا تھا جس میں پارلیمنٹ میں بل منظور نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا گیا۔ اگرچہ قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے زراعت نے اسے منظور کرلیا تھا۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے مطابق پاکستان میں تصدیق شدہ بیج کی پیداواری صلاحیت امریکہ میں 90 فیصد کے مقابلے صرف 35 فیصد ہے۔ پاکستانی بیج منڈی پر غیر پیشہ ورکمپنیوں کا غلبہ ہے جو کم پیداواری تناسب کے بیج فروخت کررہی ہیں جن کا جینیاتی مواد خالص نہیں ہے جس کے نتیجے میں منظور شدہ بیج کا فصلوں میں استعمال 15 سے 20 فیصد کم ہوگیا ہے جن میں سے زیادہ تر بیج کسانوں کے اپنے جمع کردہ بیجوں سے آتا ہے۔ معیاری بیج زرعی پیداوار بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جس کی دستیابی پیداواری ہدف حاصل کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زراعت آبادی کے زیادہ بڑے حصے کو کھلا سکتی ہے کیونکہ کسانوں نے مختلف فصلوں کے بیج کو ہر بار استعمال میں لاکر بیج کی خالصیت کو تحفظ دیا ہوا ہے لیکن یہ روایتی طریقے اب خطرے میں نظر آرہے ہیں۔ بیج جو پہلے ہی ایک تجارتی جنس بن گیا ہے اب نجی ملکیت میں دیا جارہا ہے۔ 1979 میں نجی شعبے کو ملک میں بیج کے کاروبار میں آنے کی اجازت دی گئی اور 1994 میں حکومت نے بیج کے کاروبار کو دوسری صنعتوں کے برابر درجہ دے دیا جس نے اس شعبے میں سرمایہ داروں کو راغب کیا۔

(ڈان، اکنامکس اینڈ بزنس، 8 اگست 2014، صفحہ 4)

''پلانٹ بریڈرز رائٹس'' کا قانون غیر ملکی کمپنیوں کی اجارہ داری

سندھ آبادگار بورڈ کے صدر عبد المجید نظامانی نے وزیر اعظم کو لکھے گئے ایک خط میں حکومت کی طرف سے قومی اسمبلی میں پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ پیش کیے جانے کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بل پاکستانی زرعی شعبے پر غیر ملکی کمپنیوں کے قبضے کے لیے راہیں کھول دے گا۔ عبد المجید نظامانی نے 25 جون کی اخباری خبروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ حکومت بیج پر قانون سازی پر پیشرفت جاری رکھتے ہوئے پلانٹ بریڈرز رائٹس پر بھی قانون سازی کرے گی۔ انھوں نے یاد دلایا کہ وفاقی حکومت ایسی ہی ایک کوشش گیارہ سال پہلے بھی کرچکی ہے جس میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجوزہ قانون ملٹی نیشنل کمپنیوں کو زرعی شعبے پر اجارہ داری کا اختیار دے گا جو ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیش کردہ قانون مقامی کسانوں کے بجائے دیوہیکل ملٹی نیشنل کمپنیوں کو فائدہ پہنچائے گا جس سے مقامی کسان کمپنیوں کا محتاج ہوجائے گا جو کسانوں سے بیج اور رائلٹی کی مد میں بھاری رقم طلب کریں گی جو پہلے سے ہی پسے ہوئے کسانوں پر زرعی مداخل کی مد میں آنے والے اضافی اخراجات کی صورت میں مزید بوجھ ہوگا۔ اس اقدام سے مقامی بیج اور زرعی تحقیق کی حوصلہ شکنی ہوگی جو مکمل طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے اختیار میں چلی جائے گی۔

بھارتی پالیسی سازوں نے ملٹی نیشنل کمپنیوں سے کہا ہے کہ وہ بھارت میں ہی سرمایہ کاری کرکے ٹیکنالوجی متعارف کرائیں اور بھارت کی زمین میں ہی بیج پیدا کریں۔ اس طریقہ کار سے مقامی مواد پر مشتمل جینیاتی کپاس کی پیداوار بڑھے گی اور اس کے استعمال کے بہتر مواقع حاصل ہونگے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں کو پلانٹ بریڈرز رائٹس کا قانونی تحفظ دینے سے پاکستانی معیشت خطرے میں پڑجائیگی، کمپنیاں جو بیج درآمد کریں گی وہ ان ممالک میں پیدا کیا گیا ہوگا جو پاکستان کے موسمی حالات سے مطابقت نہیں رکھتے جس سے بلا آخر پاکستان کی مجموعی فصلوں کی پیداوار متاثر ہوگی۔ غیر ملکی کمپنیوں کو پلانٹ بریڈرز رائٹس کی صورت میں قانونی تحفظ حاصل ہوجانے سے ملٹی نیشنل کمپنیاں مقامی اقسام پر قابض ہو جائینگی جس سے مقامی زرعی تحقیق کے متاثر ہونے کا امکان ہے۔ زرعی تحقیقی شعبے میں (جو پہلے ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے) تحقیق مکمل طور پر رک جائے گی۔ بغیر کسی مطابقتی اور ماحولیاتی آزمائش کے غیر ملکی اقسام متعارف کرانے کا عمل فصلوں میں نئے کیڑوں اور بیماریوں کو دعوت دے گا جو تمام فصلوں کو خطرات سے دو چار کردیں گی۔ پاکستان میں کسانوں کی اکثریت پڑھنا لکھنا نہیں جانتی جو اس قانون کے فائدے اور نقصانات نہیں سمجھ سکتے، یہ بل پاس ہونے کی صورت میں انہیں سخت حالات کا سامنا ہوگا۔ کسانوں کے وسیع تر مفاد میں سندھ آبادگار بورڈ آپ سے اور وفاقی وزیر خزانہ سے گزارش کرتا ہے کہ اس معاملہ پر نظرثانی کریں اور غریب کسانوں کے مفاد میں اس بل کی حمایت نہ کریں۔ عبد المجید نظامانی نے مزید تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجوزہ قانون کے تحت ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنے بیج جیسے ہائبرڈ اور وہ بیج جو آسٹریلیا میں خوردنی تیل کے لیے اور بھارت میں سبزیوں کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ پاکستان میں بھی فروخت کرسکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بھارتی سبزیوں کے بیج پہلے ہی پاکستان کو برآمد کیے جاچکے ہیں۔ اگر ان کمپنیوں کو کھلی چھوٹ دی گئی تو یہ پوری منڈی پر قابض ہو جائینگی۔ خیبر پختون خواہ حکومت اس تجویز کو رد کرچکی ہے لیکن وفاقی حکومت اس قانون کی منصوبہ بندی کررہی ہے جیسا کہ وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

(ڈان، 1 جولائی 2014، صفحہ 19)

فرانس میں جینیاتی مکئی پر پابندی کو حتمی منظوری مل گئی

یورپی یونین میں سب سے زیادہ اناج پیدا کرنے والے ملک فرانس کی پارلیمنٹ نے ملک میں ہر قسم کی جینیاتی تبدیلیوں کی حامل مکئی کی کاشت پر پابندی کے قانون کی حتمی منظوری دے دی ہے۔ فرانس میں عوام کی اکثریت جنیاتی مواد پر مشتمل غذا کی شدید مخالفت کرتی رہی ہے۔

فرانسیسی سینٹ کا ایوان زیریں پہلے ہی یہ قانون منظور کر چکا تھا جسے اب

فرانس کی سینٹ نے بھی منظور کرلیا ہے جس کے تحت جینیاتی مکئی کی کاشت پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ سینٹ میں اس قانون پر بحث کے آغاز میں فرانس کے وزیر زراعت اسٹیفن لی فول (Stephane le Foll) نے کہا کہ ''اس قانون کا مقصد ملک کو ایسا قانونی ڈھانچہ فراہم کرنا ہے جس سے پابندی کے اطلاق کو یقینی بنایا جاسکے''۔

مونسانٹو کی MON 810 وہ واحد جینیاتی فصل تھی جسے یورپی یونین میں کاشت کی اجازت دی گئی تھی۔ اس قانون کا اطلاق مستقبل میں یورپی یونین کی طرف سے منظور کی جانے والی بیماریوں کے خلاف مزاحمت رکھنے والی مکئی کی ہر فصل پر ہوگا جس میں ڈاؤکیمکل اور ڈوپونٹ کی مشترکہ تیار کی گئی جینیاتی مکئی کی قسم Pioneer 1507 بھی شامل ہے۔ اس جینیاتی قسم کو اس سال کے آخر میں یورپی یونین کے سربراہان کی جانب سے منظوری ملنے کا امکان ہے کیونکہ 28 میں سے 19 رکن ممالک اس جینیاتی قسم کو روکنے کے لیے مطلوبہ ووٹ حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

وزارت زراعت کے مطابق فرانس کے جنوب مغرب میں جینیاتی تبدیلیوں کے خلاف سرگرم کارکنوں نے ایک فارم پر حملہ کردیا جس کے مالک نے اطلاع کے مطابق اس نے MON810 پابندی لگنے سے کچھ دن پہلے کاشت کی تھی۔ صرف ایک اور کسان نے اسپین میں خریدے گئے مکی ء کے جینیاتی بیجوں کی اس سیزن میں کاشت کا اعتراف کیا ہے۔ وزارت زراعت نے کہا ہے کہ اگر اگلے کچھ دنوں میں متوقع ابتدائی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ اس زمین میں جینیاتی فصلیں کاشت کی گئی تھیں تو انہیں ضائع کردیا جائے گا۔ ایک اور واقع میں فرانس کی اعلی انتظامی عدالت نے فرانس کے کاشتکاروں کی طرف سے MON810 پر پابندی کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے ہنگامی بنیادوں پر عدالتی سماعت کی درخواست مسترد کردی ہے۔ کاشتکاروں نے 2011 اور 2013 کی طرح اس دفعہ بھی اس حکم کو ناکافی جواز (insufficient justification) کی بنیاد پر منسوخ کرنے کی درخواست دی تھی۔

یورپی یونین ممالک کے مابین دیرینہ اختلافات فروری میں پھر سے سامنے آگئے جب جینیاتی مکئی کی قسم Pioneer1507 کی منظوری دینے یا نہ دینے کے معاملے پر اراکین متفق نہ ہوسکے اور یورپی یونین کمیشن کو اس کی کاشت کی منظوری کے لیے اختیار دے دیا گیا۔ یورپی یونین کی سطح پر جینیاتی پالیسی پر یونان کے ساتھ بحث جاری ہے جس کے پاس اس وقت یورپی یونین کی صدارت ہے جو ایسے متفقہ حل پر کام کر رہا ہے جو یورپی یونین کے ممالک کو انفرادی طور پر جینیاتی فصلوں پر پابندی لگانے کا اختیار دے گا۔

(ریوٹرز، 5 مئی 2014)

تبصرہ

زیرنظر خبروں میں تمام ہی خبریں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں مثلاً سندھ ہائی کورٹ کا جنگلات کی زمینوں کو لیز پر دینے کا فیصلہ معطل کرنا ایک انتہائی احسن قدم ہے کیونکہ جنگلات کا ہونا مجموعی ماحولیاتی استحکام کے لیے بہت ضروری ہے۔ مگر یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ نہ صرف جنگلات کی زمین بلکہ کھیتی باڑی کے لیے زرخیز زمینوں کو بھی قبضہ کرکے رہائشی منصوبوں اور دیگر استعمال میں لانے کی کوششیں تیز ہوتی جارہی ہیں، جو کہ سراسر ہماری کسان آبادیوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔

ملتان میں شہریوں کا کھاد بنانے والے کارخانوں کے خلاف بھرپور مزاحمت ایک خوش کن قدم ہے۔ وگرنہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عوام اپنے روز مرہ کے معاملات میں اس حد تک پھنس کررہ گئے ہیں کہ اپنے ارد گرد ہونے والی انتہائی خطرناک سرگرمیوں سے غافل ہیں۔ دوسری طرف حکومت جس کی بنیادی ذمہ داری انسانی صحت اور ماحولیات کا تحفظ ہے کو پورا نہ کرکے مجرمانہ غفلت کا ارتکاب کررہے ہیں۔ کھاد کے یہ کارخانے نہ صرف ملتان بلکہ ملک کے دیگر اضلاع مثلاً گھوٹکی میں بھی اپنا زہریلا مواد اور دھواں خارج کرنے میں مصروف کار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے ملک میں کھاد پیدا کرنے والے تمام کارخانوں کو ایک ضابطہ میں لائے تاکہ ماحولیاتی اور انسانی صحت کو پہنچانے والے نقصان کا سدباب کیا جاسکے۔ وگرنہ ان کارخانوں کو بند کردیا جائے۔

اوکاڑہ میں فوجیوں کی جانب سے زمین پر قبضے کی مزاحمت پر کسانوں پر تشدد شرمناک ہے۔ مزارعین اس خطے میں نسل درنسل سے آباد ہیں اور کھیتی باڑی ان کا گزربسر ہے۔ ان کسانوں کو نہ کہ زمینیں بانٹ دی جاتیں بلکہ ان سے زمین ہتھیانے کے نت نئے طریقے آزمائے جارہے ہیں۔ مگر یہ کسان مالکی یا موت کے نعرے کے تحت بھرپور مزاحمت کررہے ہیں۔ اس نام نہاد عوامی حکومت کو چاہیے کہ اپنا موثر کردار ادا کرے اور مزارعین کو زمینوں کی ملکیت دینے کا اعلان کرے۔

اوپر پیش کیے گئے خبروں میں سب سے خطرناک خبر تھر میں قحط سے بچوں کی اموت ہیں۔ حکومت سندھ اس معاملے پر انتہائی غیر سنجیدگی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کررہی ہے۔ لگتا ہے کہ حکومت کو معاملے کی سنگینی کا قطعی اندازہ نہیں ہے۔ اپنے شہریوں کی ہلاکت کو اس حد تک نظر انداز کرنا اس بات کا کھلا اشارہ ہے کہ حکومت کی ترجیح کچھ اور ہے۔ تھر میں قحط سے بچوں کا مرجانا معاشرتی گراوٹ کا عملی نمونہ ہے۔ تھر میں بچوں کی ہلاکتیں تاحال جاری ہیں اور بحث یہ ہورہی ہے کہ بچوں کی اموات بھوک کی وجہ سے نہیں بلکہ غربت کی وجہ سے ہے۔ حکومتی زعماء کا ان اموات پر اس بچگانہ مباحثے پر صرف ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔

ایک طرف ہماری حکومت عوام تک غذا کی فراہمی پر سنجیدہ نہیں اور دوسری طرف یورپی یونین خصوصاً فرانس اپنی عوام کے لیے جینیاتی طور پر تیار کردہ آلودہ فصلوں کی پیداوار کی روک تھام کے لیے قانون سازی میں مصروف ہے۔ یقیناً یہ عمل حکومت پاکستان کی بے حسی کا عملی نمونہ ہے۔ ان حالات میں ایک بھرپور عوامی جدوجہد ہی عوام کے لیے کچھ آسانیاں مہیا کرسکتی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو تھر جیسے کئی اور واقعات کا رونما ہونا عجب نہ ہوگا۔